ایم اے راحت
شاہکار

ایم اے راحت

نواب سنز پبلی کیشنز

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

فہرست

فن کدہ

آذر کی نگاہیں ایک بار پھر اس بوڑھے شخص کی جانب اُٹھ گئیں جو آرٹ گیلری میں مختلف تصویروں کے سامنے چکراتا پھر رہا تھا۔ مداحوں کے بے پناہ ہجوم میں یہ واحد ایسا شخص تھا جو ان تصویروں کو دیکھ کر بُرے بُرے منہ بنا رہا تھا۔ آذر کو اس کی کیفیت بڑی چُبھ رہی تھی۔ پریس فوٹو گرافر اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے اور وہ انہیں جواب دے رہا تھا' پھر اس نے ان سے چند لمحات کے لیے معذرت کی اور بولا۔

''میں ابھی حاضر ہوا۔'' اور اس کے بعد اس کے قدم اس مجہول سے بوڑھے آدمی کی طرف اُٹھ گئے وہ اس کے قریب پہنچ گیا اور اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے بوڑھے سے کہا۔

''بابا صاحب! کوئی تصویر پسند آئی آپ کو؟ ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ کو یہ تصویریں پسند نہ آ رہی ہوں۔''

''تصویریں۔'' بوڑھا حقارت سے بولا۔

''یہ تصویریں ہیں؟ جو بھی ان کا خالق ہے اس کے سر پر پچاس جوتے لگانے

چاہئیں' اسے نہ رنگوں کا استعمال آتا ہے نہ برش پکڑنا' نہ اس کے ہاتھ لکیروں سے کوئی واقفیت رکھتے ہیں' میرا بس چلے تو مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دوں۔''

''اچھا...... آیئے ذرا میں آپ کو اس سے ملاتا ہوں۔'' آذر نے غصہ ضبط کر کے کہا۔ کروڑ پتی باپ کی اولاد تھا' مصوری اس کا شوق تھی اور کروڑ پتی باپ کی اولاد جو کام بھی کرتی ہے اسے سراہنے والے لاتعداد مل جاتے ہیں۔ چنانچہ آرٹ گیلری بھری ہوئی تھی اور لوگ اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے' لیکن وہ جانتا تھا کہ کچھ ایسے بھی ہیں جو اسے بدنام کرنا چاہتے ہیں اور یہ بوڑھا انہی کا فرستادہ ہے۔ آرٹ گیلری کا آفس اس وقت خالی پڑا ہوا تھا۔ آذر بوڑھے کو آفس میں لے گیا پھر اس نے دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بابا جی' اب تم اُگل دو کہ کس کے ایما پر یہاں آئے ہو اور کس کے کہنے سے یہ بُرے بُرے منہ بنا رہے ہو نیز یہ کہ کیا تم مصوری کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

''تُو کون ہے؟''

''میں ان تصویروں کا خالق ہوں جنہیں تم ناکارہ تصویریں کہہ رہے ہو اور کہتے ہو کہ اس کے خالق کو پچاس جوتے لگانے چاہئیں۔''

''تیرے سر پر تو سو جوتے لگانے چاہئیں۔ بے وقوف' ان لوگوں کی تعریفوں میں آ کر تو اپنے آپ کو مکمل سمجھ بیٹھا ہے' ارے یہ سارے تیرے دشمن ہیں' یہ تجھے اسی جگہ روک دینا چاہتے ہیں' تیرے فن' تیرے شوق کو آگے نہیں بڑھنے دینا چاہتے' قاتل ہیں یہ تیرے قاتل ہیں' جو تجھے مکمل کہتے ہیں' بیوقوف لڑکے...... فن تو ایک سمندر ہے اور زندگی محدود' فن کے سمندر سے اگر کسی انسان کی زندگی میں ایک قطرہ بھی شامل ہو جائے تو وہ زندگی جاوداں ہو جاتی ہے اور تو اپنے آپ کو مکمل کہتا ہے۔''

''خبیث بوڑھے...... بتا مجھے فن کیا ہوتا ہے' تو بھلا فن کے بارے میں کیا جانتا ہے؟'' آذر نے حد سے زیادہ چراغ پا ہوتے ہوئے کہا اور بوڑھے کے چہرے پر نفرت کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں اور ان میں سے ایک کوئلہ نکالا۔ پھر اس نے سفید دیوار پر کوئلے سے کچھ لکیریں بنائیں جو ایک کوڑیالے سانپ کی شکل کی تھیں اور پھر اس نے سانپ کے سامنے چٹکی بجائی اور بولا۔

''بتا اسے فن کیا ہوتا ہے؟'' اور کوڑیالہ سانپ لہراتا ہوا دیوار سے زمین پر اُتر آیا' آذر کی آنکھیں شدت حیرت سے پھیل گئیں۔ سانپ اس کی جانب بڑھ رہا تھا' آذر لپک کر ایک میز پر چڑھ گیا۔

بوڑھے کا قہقہہ بڑا گھن گرج تھا' وہ دروازے کے قریب پہنچا اور دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولا۔

''بیوقوف! فن حاصل کر...... ان احمقوں کی باتوں میں نہ آ......''

آذر میز پر پتھرایا ہوا سا کھڑا تھا' بوڑھا باہر نکلا اور آخری جملہ اس نے کہا۔

''اپنی زندگی اس فن کو سونپ دے' دیکھ تیرا فن کس طرح تیرا محافظ بنتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا' آذر اپنی جگہ کھڑا جھوم رہا تھا۔

☆......☆......☆

گھر کے تمام لوگ آذر کے فن کدے سے شعلے نکلتے دیکھ کر بدحواس ہو گئے اندر سے آذر کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

''تم سب' تم سب مجھے بیوقوف بناتے رہے ہو' میری تخلیقوں...... تم نے مجھے اپنے آپ میں قید کر کے مفلوج کر دیا ہے' مجھے فن چاہیے وہ فن جو دیوار سے اُترتا ہے

اور مصور کو نئی زندگی دلوا دیتا ہے' وہ فن چاہیے مجھے' تم سب میرے قاتل ہو' تم نے مجھے اپنی رنگینیوں کے جال میں جکڑ کر مجھے روک دیا ہے' مجھے فن کی تلاش ہے۔''

دروازہ توڑ کر آذر کو باہر نکالا گیا۔ اس نے اپنے فن کدے میں آگ لگا دی تھی' وہ تصویریں جو اس نے اپنے خون جگر سے بنائی تھیں جل کر خاکستر ہو چکی تھیں۔ سب کچھ تباہ کر دیا تھا اس نے' کمرہ کباڑ خانہ بنا ہوا تھا' بمشکل تمام وہ آذر کو لے کر باہر آئے' لیکن اسی رات آذر اپنی خواب گاہ کی کھڑکی کود کر فرار ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

اب اس کی شکل ایک مفلوج فقیر کی سی تھی' بدن پر چیتھڑے لگے ہوئے تھے' ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی' بال بکھرے ہوئے تھے جبکہ وہ ایک انتہائی نفیس نوجوان تھا۔ جس کی خوش لباسی اور نفاست پرستی کی مثالیں دی جاتی تھیں' لیکن لوگوں نے بہت عرصے سے اس مجہول سے نوجوان کو دیکھا تھا جو ہر ایک سے ہاتھ پھیلا کر کہتا تھا۔

''مجھے فن دے دو' میں فنکار بننا چاہتا ہوں' وہ فن جو زندہ ہو جاتا ہے۔''

کوئی اس کی بات نہیں سمجھ پاتا تھا' لیکن ایک چلچلاتی دوپہر ایک کوڑے دان کے قریب ایک شخص نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور آذر کی آنکھیں اس کی طرف اُٹھ گئیں۔ اور پھر وہ بُری طرح اُچھل کر کھڑا ہو گیا' یہ وہی بوڑھا تھا جو اس کے وجود میں آگ سُلگا کر چلا گیا تھا' اس نے بوڑھے کے پاؤں پکڑ لئے۔

''مجھے فن دے دو' عظیم مصور مجھے فن دے دو۔''

''آ میرے ساتھ' اب فن کی تلاش تجھ میں مکمل ہوئی ہے۔'' بوڑھا اسے ایک ایسے گھر میں لے گیا جس میں صرف ایک کمرہ تھا' کمرے کے وسط میں بہت بڑا

کینوس بورڈ رکھا ہوا تھا اور ساتھ ہی رنگ اور برش کا ایزل' بوڑھے نے برش کو گلاس میں ڈبویا اور پھر اسی برش سے کینوس کے بورڈ پر ایک گلاس تخلیق کیا' اس کے بعد اس نے اس گلاس میں سرخ رنگ کا پینٹ کیا اور ہاتھ بڑھا کر گلاس کینوس بورڈ سے اتار لیا۔

''لے یہ شربت پی لے پیاسا ہے' ہونٹ خشک ہو رہے ہیں۔''

آذر نے بڑے احترام سے شربت کا وہ گلاس اس کے ہاتھ سے لیا تو بوڑھے نے جلدی سے دوسرے برش سے ایک اسٹول کی تصویر بنائی اور پھر اسٹول کینوس بورڈ سے اتار کر نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹھ جا اس پر۔'' آذر اسٹول پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ گھونٹ گھونٹ کر کے شربت پی رہا تھا اور اس کے منہ سے یہی آواز نکل رہی تھی۔

''مجھے وہ زندہ فن دے دو' مجھے وہ زندہ فن دے دو۔''

تب بوڑھے نے کینوس بورڈ پر ایک دروازے کی تصویر پینٹ کی اور اس کے بعد اس کا ایک پٹ کھول کر آذر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

''آ...... میں تجھے فن کی دنیا میں لے چلوں۔'' آذر اس کے ساتھ قدم بہ قدم دروازے کی جانب بڑھ گیا اور جب اس نے دروازے کی دوسری جانب قدم رکھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

ایک حسین اور جمیل سرسبز و شاداب جنگل تھا جس میں ہزاروں حسین درخت لہلہا رہے تھے۔ درختوں کی جڑوں میں سبز گھاس پر اتنے حسین پھول کھلے ہوئے تھے کہ دیکھ کر انسان مر جانے کی آرزو کرے۔ خوبصورت پرندے اپنی حسین آوازیں سنا رہے تھے' دور برف پوش پہاڑوں سے جھرنے گر رہے تھے۔ بوڑھا اسے قدم قدم آگے لیتا چلا گیا۔ اس کی آواز ابھر رہی تھی۔

''دیکھ رہا ہے' یہ ہے اس فنکار کی تخلیق کی ہوئی دنیا جو آسمان کی بلندیوں پر بیٹھا مسکراتی نگاہوں سے اپنی مخلوق کو دیکھ رہا ہے' جسے اُس نے کائنات میں اشرف کر کے بھیجا ہے۔ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ علم اور فن کے سمندر سے کچھ قطرے سمیٹ لے کہ زندگی محدود ہے' بڑھتا چلا جا' لے میں تجھے یہ برش دیتا ہوں' جا اور فن کے لیے مشق کر' اور زندگی میں کبھی اپنے آپ کو مکمل نہ سمجھ کیونکہ انسان کی تکمیل صرف اللہ کی ذات میں ضم ہو کر ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو جس قدر کمتر سمجھے' ذات باری اسی قدر خوش ہوتا ہے۔ کبھی اپنے آپ کو مکمل نہ سمجھنا۔ یہی تیرے فن کی معراج ہے۔

ختم شد

ٹیپو

چوہدری جلال ایک ماہر شکاری تھا' قیام ایک پہاڑی مقام پر تھا اور اس کے اطراف میں پھیلے ہوئے جنگلوں سے انہیں پوری واقفیت تھی' اکثر ان کے شکاری دوست شکار کھیلنے کے لیے ان کے پاس آجایا کرتے تھے اور پھر پارٹیاں جنگلوں میں نکل جاتیں' ان جنگلوں میں ہر طرح کے جانور موجود ہوا کرتے تھے' ایک بار چوہدری جلال شکاری پارٹی سے الگ جنگل سے گزر رہے تھے کہ انہیں ایک پرانے برگد کی جڑوں کے پاس شیر کا ایک چھوٹا سا بچہ دکھائی دیا' چوہدری جلال کو اندازہ ہو گیا کہ بچہ اپنے ماں باپ سے بچھڑ کر اس طرف آ نکلا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے اپنے قبضے میں کر لیا اور پھر اسے اپنے گھر لے آئے۔

بھرے پرے گھر کے مالک تھے' چوہدرائن نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے اس بات پر اعتراض کیا کہ یہ درندہ گھر میں پلے گا۔ تو چوہدری جلال نے ہنس کر کہا۔

''بھاگوان! بچے انسان کے ہوں یا جانور کے کسی پیارے نہیں لگتے۔ یہ بڑا ہو جائے گا تو دیکھ لیں گے ابھی تو یہ بچہ ہی ہے۔'' اور یہ حقیقت تھی کہ شیر کا یہ بچہ گھر کے بچوں سے خوب گھل مل گیا تھا' چوہدری جلال نے اس کا نام ٹیپو رکھا تھا۔ گھر میں ٹیپو کی

پسندیدہ جگہ چوہدری جلال کی بیٹھک تھی' وہ اطمینان سے صوفے پر دراز ہو جاتا اور پروقار انداز میں ایک ایک کو دیکھتا رہتا' غراتا صرف اس وقت تھا جب کوئی اس کی جگہ لینے کی کوشش کرتا' گھر کے بچوں کے ساتھ وہ بچوں ہی کی طرح کھیلتا اور اس کا دلچسپ کھیل یہ ہوتا کہ وہ دبے پاؤں گھات لگا کر اپنے ساتھ کھیلنے والے کے پاس پہنچ جاتا اور اس کے پیروں میں لوٹنے لگتا۔

گھر کے بچوں سے اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی' وہ اپنی آنکھوں میں عیارانہ چمک لئے دبے پاؤں کسی کی جانب بڑھتا اور نزدیک آتے آتے ایک دم سے چھلانگ لگاتا اور قدموں میں گھس کر خوشی سے لاتیں چلاتا' بظاہر وہ اپنے شکار کی پنڈلیاں کاٹنے کی کوشش کرتا' بہرحال اس کی عمر بڑھتی رہی اور اس کے ساتھ ہی ڈیل ڈول بھی' رات کو وہ خاص طور سے گھر کے ملازم حمید کے کوارٹر میں سوتا تھا' چوہدرائن اکثر کہتیں۔

''تم دیکھ لینا چوہدری صاحب درندہ آخر درندہ ہوتا ہے کسی دن جب حمید کے کوارٹر میں جائیں گے ہم لوگ تو ٹیپو ہمیں اس کے بستر پر سوتا ہوا ملے گا اور حمید کا نام ونشان نہیں ہوگا۔''

اور اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا' ٹیپو چھ ماہ کا ہوا تو اس کے تیور خطرناک نظر آنے لگے' گھر کے افراد اور نوکر چاکر محتاط ہو گئے' کسی کو اس پر اعتبار نہیں رہا' اس کی نقل وحرکت مشکوک ہوتی چلی گئی' کبھی کبھی وہ بڑے خاص انداز میں حمید کے پیچھے اس طرح گھومتا جیسے موقع ملتے ہی اس پر حملہ کر دے گا اس کی آنکھوں میں ایک انتہائی تیز چمک ہوتی تھی اور چوہدری جلال چونکہ خود ماہر شکاری تھے اس لیے اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر وہ پریشان ہو جایا کرتے تھے' یہاں تک کہ خود انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب ٹیپو کو گھر سے جدا کر دینا چاہیے چنانچہ بڑے دکھ بھرے انداز میں انہوں نے بستی سے شہر جا کر ٹیپو کو ایک چڑیا گھر کے حوالے کر دیا' چڑیا گھر کے

ملازموں نے انہیں شکریہ کے ساتھ ایک سرپرست کی سند دی تھی۔

تقریباً چھ ماہ تک چوہدری جلال کو یہ موقع نہیں مل سکا کہ وہ دوبارہ شہر جا کر ٹیپو کی خبر معلوم کر لیتے' اکثر انہیں خیال آتا تھا کہ پتہ نہیں ٹیپو اپنے نئے گھر میں کس طرح رہ رہا ہوگا' لیکن ساتویں مہینے شہر کی ایک تقریب میں چوہدری جلال چوہدرائن وغیرہ گئے تو چوہدری صاحب کو ٹیپو یاد آ گیا' انہوں نے پہلی فرصت میں چڑیا گھر کا رخ کیا اور پھر سیدھے ٹیپو کے پنجرے پر پہنچ گئے' ٹیپو ایک گوشے میں دبکا ہوا تھا' اب وہ پوری طرح جوان ہو گیا تھا اس کے جسم کی دھاریاں روشنی میں جگمگا رہی تھیں' وہ خوب تندرست وتوانا دکھائی دے رہا تھا' چوہدری جلال بے اختیاری میں جنگلہ پھلانگ کر پنجرے کے پاس چلے گئے اور پھر انہوں نے اسے آواز دی۔

''ٹیپو۔'' ٹیپو چند لمحوں تک انہیں دیکھتا رہا' چوہدری صاحب نے اپنا ہاتھ بے تکلفی سے سلاخوں کے اندر کر دیا۔ کچھ لمحوں کے بعد ٹیپو اپنی جگہ سے اٹھا اور سلاخوں کے نزدیک آ گیا' چوہدری جلال بے اختیار دونوں بازو اس کی گردن میں ڈال کر اس کا سر اور کان سہلانے لگے۔ ٹیپو کے حلق سے غراہٹیں نکل رہی تھیں' پھر وہ ایک بار دھاڑا تو چوہدری صاحب نے اس کے منہ پر ایک چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

''خاموش بدمعاش! اب بھی بالکل ویسا ہی ہے' ذرا بھی نہیں بدلا تجھ میں کچھ۔''

ٹیپو چوہدری صاحب کا ہاتھ چاٹنے لگا۔ بہرحال دیکھتے ہی دیکھتے وہاں بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے' آدمی اور شیر کو آپس میں اتنا مانوس دیکھ کر سب لطف اندوز ہونے لگے' لیکن پھر دور سے چڑیا گھر کے ایک نگراں نے یہ منظر دیکھا اور دہشت سے چیختا ہوا چوہدری جلال کے پاس پہنچ گیا۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں جناب۔ آپ نے یہ بورڈ نہیں پڑھا یہاں آنا منع ہے' آپ عمر رسیدہ ہو کر یہ......

''او پاگل میں اپنے ٹیپو سے باتیں کر رہا ہوں' تو کوئی نیا معلوم ہوتا ہے' چھ مہینے پہلے میں ہی اسے یہاں لایا تھا۔ تو اس وقت شاید موجود نہیں تھا۔''

''وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں صاحب میں ابھی کچھ دنوں پہلے ہی یہاں آیا ہوں' لیکن جانور تو جانور ہی ہوتا ہے' کہیں یہ خطرناک نہ ہو جائے۔''

''او پاگل میرے لیے یہ بالکل خطرناک نہیں ہوگا۔''

''یہ بہت خطرناک شیر ہے صاحب' اسے آج تک کوئی بھی ہاتھ نہیں لگا سکا' غصے کا بہت تیز ہے یہ' سب اس سے ڈرتے ہیں۔''

''شاباش میرے ٹیپو تو نے سب کی ہوا کھسکا رکھی ہے۔'' چوہدری جلال ٹیپو سے پھر باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ دیر تک وہ اس کا سر سہلاتے رہے۔ ایک بار پھر چڑیا گھر کا ایک دوسرا محافظ اس طرف آیا' اسے چوہدری جلال نے پہچان لیا' جب وہ ٹیپو کو چڑیا گھر میں دینے آئے تھے تو یہ محافظ موجود تھا' چوہدری جلال نے کہا۔

''او بھئی تو تو مجھے جانتا ہے نا۔''

''جی چوہدری صاحب اچھی طرح جانتا ہوں آپ کو' ......لل......لیکن یہ یہ یہ...... یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''کیوں بھئی' یہ بڑا ہو گیا ہے تو تیرا کیا خیال ہے یہ مجھے نقصان پہنچا دے گا۔''

''لیکن چوہدری صاحب یہ آپ کا شیر نہیں ہے۔'' محافظ نے اٹکتے ہوئے بتایا۔

''او کیا بک رہا ہے یار' ٹھیک ہے میں اسے کونسا اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں اب یہ بے شک میرا نہیں ہے' لیکن میرے اور اس کے درمیان وہی محبت ہے۔''

''چوہدری صاحب میری بات تو سنیں' یہ آپ کا شیر نہیں ہے' یہ وہ نہیں ہے جسے آپ لے کر آئے تھے۔''

''کیا۔'' دادا جان نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''ہاں جی...... وہ دو ماہ پہلے مر چکا ہے' آپ کسی سے بھی معلوم کر لیجئے۔ یہ تو ابھی پچھلے ہفتے پہاڑوں سے پکڑ کر لایا گیا ہے' یہ تو جناب بڑا خطرناک ہے' چوہدری جلال پھٹی پھٹی آنکھوں سے شیر کو دیکھ رہے تھے' شیر بدستور ان کے ہاتھ چاٹ رہا تھا' چوہدری جلال نے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ سلاخوں سے نکال لئے اور پھر اپنا چہرہ سلاخوں کے قریب لے گئے اور شیر کے سامنے منہ کر کے آہستہ سے بولے۔

''خدا حافظ ٹیپو۔'' ان کی آواز میں گہری لرزشیں تھیں اور پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے چڑیا گھر سے باہر نکل آئے۔

ختم شد

فنکار

بین الاقوامی حیثیت کا شہر کراچی ہر طرح کے فنون سے آراستہ ہے' یہاں بڑے سے بڑا انجینئر' بڑے سے بڑا ڈاکٹر' صداکار' گلوکار' کلاکار ہر قسم کے کار میں مصروف مل جاتا ہے۔ فنکار' اب فنون لطیفہ یا فنون کثیفہ کی تشخیص تو اسی وقت ہوسکتی ہے جب انسان پر خود کچھ بیتی ہو۔ یہ ایک سچا واقعہ ہے جو کراچی کے ایک متوسط علاقے میں پیش آیا۔

ریحان ایک دفتر میں ملازم تھا' اچھی حیثیت کا مالک' متناسب زندگی گزارنے والا' ایک بیوی اور تین بچوں کے ساتھ اس نے اپنی زندگی کو ایک ایسے نقطے پر مرکوز کر لیا تھا' جس میں اس نے اپنی آسائشوں اور ضرورتوں کو محدود رکھا تھا اور ضرورتیں محدود رکھنے ہی سے زندگی کے مسائل حل ہوتے ہیں۔ اپنے اوقات کار میں ہمیشہ مستعد رہا تھا' چنانچہ اس دن بھی اس نے مقررہ وقت پر اپنی گاڑی گیٹ سے باہر نکال کر کھڑی کی' دو بیٹے اور بیٹی اتنے بڑے نہیں تھے کہ ابھی کسی مسئلے میں اس کا ہاتھ بٹا سکتے' جو کچھ کرنا ہوتا خود ہی کرنا ہوتا تھا۔ گاڑی باہر کھڑی کرنے کے بعد وہ لباس وغیرہ درست کرنے کے لیے اندر چلا گیا۔

پھر بیگم کی شام کی فرمائشوں کی فہرست لے کر باہر نکلا تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ گاڑی دروازے کے باہر موجود نہیں تھی' چابی اس کے اپنے ہاتھ میں تھی۔ البتہ یہ غلطی کی تھی اس نے کہ گاڑی میں چور لاک نہیں لگوایا تھا' حالانکہ بیوی نے کتنی ہی بار کہا تھا کہ حالات درست نہیں ہیں' تھوڑے سے پیسے خرچ کر کے چور لاک لگوا لو' کم از کم گاڑی تو حفاظت سے رہے گی' بہرحال یہ تو طے تھا کہ کوئی فنکار دروازہ کھول کر گاڑی لے اُڑا ہے۔ ریحان پریشانی کے عالم میں کھڑا رہا۔ بیوی اسے ہمیشہ دروازے پر آ کر خدا حافظ کہتی تھی۔ کسی کام سے رُکی ہوئی تھی دوڑتی ہوئی باہر آئی تو ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ ریحان چلا گیا ہے کیونکہ گاڑی موجود نہیں تھی' لیکن ریحان گیٹ کے برابر خاموش اور اداس کھڑا ہوا تھا۔

''ارے خیریت کیا ہوا' گاڑی کہاں ہے؟''

''گئی''

''کیا مطلب؟''

''کوئی لے گیا۔'' ریحان کی بیوی بھی ششدر رہ گئی تھی۔

''کچھ کرو' جا کر تھانے میں رپورٹ لکھواؤ۔''

''میری تو جان نکل گئی ہے' کیا بتاؤں' گاڑی تھرڈ پارٹی انشورنس تھی' اس کے پیسے بھی نہیں ملیں گے ہمیں۔'' بیوی کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے' غمزدہ لہجے میں بولی۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''میری طبیعت کچھ خراب ہو رہی ہے۔ چلو اندر چلو۔''

''تھانے نہیں جائیں گے۔''

''ارے تم چلتی ہو اندر یا تھانے تھانے لگائے رہو گی۔'' ریحان نے کہا اور خود گیٹ سے اندر داخل ہوگیا۔ پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا برآمدے میں ایک

کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا تھا' بیوی کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے' ریحان نے بوجھل آواز میں کہا۔

''ذرا دفتر فون کر دو' ان سے کہہ دو کہ میری طبیعت خراب ہے' میں آج دفتر نہیں آسکوں گا۔''

''میں جاتی ہوں۔'' ریحان کی بیوی بولی اور اس کے بعد وہ ٹیلیفون کرنے چلی گئی۔ریحان کا دماغ چکرا رہا تھا۔ زندگی میں کبھی تھانے جانے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی تھی۔ وہ جانتا تھا تھانے جائے گا' رپورٹ درج کرائے گا اور الٹے سیدھے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا اسے' لیکن رپورٹ درج کرانا بھی ضروری تھا۔ ہزاروں طرح کے واقعات کراچی شہر میں ہورہے تھے' گاڑیوں کے ذریعے وارداتیں کی جاتی تھیں۔ پھر یہ گاڑیاں واردات کی جگہوں پر مل جاتی تھیں یا پکڑی جاتی تھیں تو گاڑی کے مالک سے پوچھ گچھ ہوا کرتی تھی' بہرحال یہ پولیس کی بھی مجبوری تھی' تھانے جا کر گاڑی کی گمشدگی یا چوری کی رپورٹ درج کرانا بھی ضروری ہے۔لیکن ابھی اعصاب ساتھ نہیں دے رہے تھے اور فوری جھٹکے نے بری طرح نڈھال کر رکھا تھا۔ بیوی فون کر کے واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔

''آپ تو بہت زیادہ نروس ہو گئے ہیں۔ یہ پانی پئیں۔''

''ہاں دو' میں تم سے مانگنے ہی والا تھا۔'' ریحان نے کہا پانی کا گلاس پی کر اس نے بیوی کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ریحان کے ہونٹوں پر مدہم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''جمیلہ......رو رہی رہو۔''

''اب کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوگا اللہ مالک ہے' جو تقدیر میں لکھا ہے وہی ہوگا۔ گاڑی اگر ہماری

قسمت میں نہیں ہے تو نہ سہی' پھر پیسے جمع کریں گے تھوڑے تھوڑے اور جب اتنے ہو جائیں گے کہ گاڑی خرید سکیں تو دوسری گاڑی خرید لیں گے۔''

''تو تو وہ گاڑی اب کبھی نہیں ملے گی۔'' ریحان خاموش ہو گیا' جانتا تھا کہ جب اس طرح چیزیں چلی جاتی ہیں تو ملنا مشکل ہی ہوتا ہے' بہت سے واقعات اس کے علم میں تھے' ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا ''میں جارہا ہوں رپورٹ درج کرانا ضروری ہے۔''

''کیسے جائیں گے؟''

''رکشہ کر کے چلا جاؤں گا۔ جانا کونسا مشکل کام ہے۔تم ذرا بچوں کا خیال رکھنا اگر مجھے دیر ہو جائے تو خود انہیں لینے چلی جانا' رکشہ والا آجائے گا اس کے ساتھ چلی جانا۔''

''ریحان' مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے' میں اکیلے اکیلے......''

''ڈرنے کی کیا ضرورت ہے جمیلہ ظاہر ہے جسے کار لے جانا تھی وہ کار لے گیا' اب سب کچھ بیکار ہے۔''

''ایسا کر لو ریحان' اگر فوراً ہی جانا ضروری نہ ہو تو ذرا دیر سے تھانے چلے جانا۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے بچوں کو لینے کے لیے......'' ریحان خود بھی ایک عجیب سا اعصابی تناؤ محسوس کر رہا تھا' تھانے جا کر تو صرف کارروائی کرنی تھی' کار تو واپس ملنے سے رہی' کوئی دو تین گھنٹے اسی طرح رد و قدح میں گزر گئے۔ بچوں کی چھٹی کا وقت ہو گیا۔ رکشہ والا آیا تو ریحان نے کہا۔

''ایسا کرتے ہیں ہم دونوں چلتے ہیں' رکشہ والا مجھے تھانے چھوڑ دے گا تم

بچوں کو لینے چلی جانا' بات بن جائے گی' میں رپورٹ درج کرا کے واپس آ جاؤں گا۔'' اور پھر چند منٹ کے بعد دونوں باہر نکلے لیکن باہر کا منظر دیکھ کر نہ صرف ریحان بلکہ جمیلہ بھی دنگ رہ گئی تھی۔ ان کی کار دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ دونوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کار کو دیکھنے لگے۔ یہ کیا قصہ ہے' کار واپس کہاں سے آ گئی' جمیلہ نے حیران نگاہوں سے ریحان کو دیکھا' ریحان کے چہرے پر خوشی کے آثار دوڑ گئے تھے۔ وہ تیزی سے کار کے قریب پہنچا اور اسے اندر باہر سے جھانکنے لگا۔ کار بالکل صحیح سالم حالت میں تھی۔ ٹیپ ریکارڈر' ہیٹر اور دوسری تمام چیزیں جو اس میں پہلے سے لگی ہوئی تھیں' موجود تھیں۔ لیکن کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک پرچہ رکھا ہوا تھا' ریحان نے جلدی سے جمیلہ سے چابی لانے کے لیے کہا' جمیلہ دوڑ کر اندر گئی اور چابی اٹھا لائی' کار کا دروازہ باقاعدگی سے لاک تھا۔ ریحان نے دروازہ کھولا' پرچے کے ساتھ ہی ایک لفافہ بھی تھا۔ ریحان نے سب سے پہلے پرچہ کھول کر پڑھنا شروع کیا اس پر لکھا تھا۔

''محترم دوست! بے شمار معذرت کے ساتھ آپ کی کار واپس ہے' کراچی کے حالات کا تو آپ کو علم ہی ہے۔ خاص طور پر صبح کے وقت ٹیکسی حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ میری ماں کی طبیعت سخت خراب ہو گئی تھی۔ کوئی پونے گھنٹے تک سڑکوں پر ٹیکسی ٹیکسی چیختا ہوا بھاگا بھاگا پھرتا رہا' لیکن کوئی ٹیکسی ڈرائیور سیدھے منہ بات ہی نہیں کر رہا تھا۔ ماں کو ہسپتال لے جانا بہت ضروری تھا چنانچہ انتہائی شرمندگی کے ساتھ آپ کی کار لے کر چل پڑا۔ ماں کو ہسپتال لے گیا' اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اب ان کی حالت بہتر ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ لوگ کتنے پریشان ہوئے ہوں گے۔ شرمندگی اور معذرت کے ساتھ ایک بہت اچھی فلم کے پانچ ٹکٹ آپ کی نذر کیے جا رہے ہیں' نو سے بارہ بجے کی فلم ہے' میری دیکھی ہوئی ہے'

ہو سکتا ہے آپ کی بھی دیکھی ہو' بہرحال میں یہی خدمت کر سکتا تھا گر قبول افتد۔''

ریحان کے حلق سے قہقہہ نکل گیا اس نے کہا۔ ''بھائی! تیرا ڈبل ڈبل شکریہ' لیجیے جمیلہ صاحبہ آپ کی فرمائش بھی پوری ہو گئی' اب آپ ایسا کریں کہ جلدی سے رکشہ میں بیٹھ کر جائیں اور بچوں کو لے آئیں۔''

''میں جاتی ہوں۔'' تھوڑی دیر کے بعد بچے بھی آ گئے' انہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی تھی' خوشیاں ایک بار پھر واپس آ گئی تھیں۔ رات کو جلدی جلدی کھانے سے فراغت حاصل کی گئی اور اس کے بعد سب کے سب کار میں بیٹھ کر فلم دیکھنے چل پڑے۔ فلم ذرا بڑی تھی ساڑھے بارہ بجے ختم ہوئی' اور وہ گھر واپس پہنچ گئے۔ لیکن دروازے پر پہنچے تو گیٹ کھلا ہوا تھا' ریحان کا دل دھک سے ہو گیا۔ لرزتے قدموں سے اندر پہنچ کر روشنی جلائی' گھر کا سارا سامان تتر بتر پڑا ہوا تھا' بے شمار قیمتی اشیاء ٹیلی ویژن' وی سی آر' فریج' ایئرکنڈیشنر' بے شمار چیزیں غائب تھیں' الماریاں کھلی پڑی تھیں' قیمتی زیورات اور وہ تمام ساز و سامان جو آسانی سے لے جایا جا سکتا تھا لے جایا گیا تھا' فنکاروں نے دوہرے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ صبح کو کار کو غائب ہونا شام کے لیے ایک زبردست پلاننگ تھی۔ بات ظاہر ہے بُری ہے' لیکن اب یہ فنکاری کراچی میں عام ہو چکی ہے۔

ختم شد

دوستی

جمالو بابا۔ دوستوں کے دوست تھے۔ ہم بچے تو ان سے بہت ہی زیادہ گھلے ملے رہا کرتے تھے۔ حیرت تو یہ تھی کہ ان کی دوستی ایک کالے سانپ سے تھی اور شاید ہم ان کی باتوں کو جھوٹ سمجھتے' لیکن ہم نے اپنی آنکھوں سے اس کالے سانپ کو دیکھا۔ ایک انسان اور سانپ کی دوستی کی اس سے انوکھی مثال اور کوئی نہیں مل سکتی۔ جمالی بابا! باقاعدہ سانپ کو دودھ پلایا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا۔

''آپ ہمیں بیوقوف بناتے ہیں جمالی بابا! سانپ دودھ نہیں پیتے ہمیں جہاں تک اس کا علم ہے سانپ دن میں ایک ہی بار کھاتا ہے۔ ہم نے گھاس والے ایک سانپ کو دیکھا اس سے مینڈک نکلا تھا۔ مینڈک اس کے حلق میں اٹکا رہا اس کو دم تک پہنچنے میں کئی دن لگے' ہماری لیبارٹری میں بھی درجنوں سانپ پڑے ہیں۔ پچھلے ہی مہینے ہماری ٹیچر نے ایک سپیرے سے سانپ خریدا تھا۔ وہ سر اور دم دونوں کی طرف سے بھاگ سکتا تھا۔ اس کی دم میں آنکھوں سمیت ایک اور سر لگا ہوا تھا۔ ہم نے اسے مرتبان میں ڈالا تو کیا بتائیں کتنا مزہ آیا۔ لیبارٹری

میں اس وقت کوئی خالی مرتبان نہیں تھا اس لیے ٹیچر نے اسے ایک ایسے مرتبان میں ڈال دیا جس میں پہلے سے ایک زہریلا سانپ موجود تھا۔ مرتبان میں ایک طوفان سا مچ گیا۔ جیسے ہی شیشے کے اندر سانپ ایک دائرے کی شکل گھوما۔ تو اس نے گلے سڑے سانپ کی دھجیاں اڑا دیں۔''

''ارے نہیں بیٹا! کیڑے مکوڑے بھی اللہ کی مخلوق ہوا کرتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں جمالی بابا جو ہمارے گھر ملازم تھے اس سانپ سے بہت متاثر تھے۔ ویسے بھی وہ کہتے تھے کہ کسی بھی جاندار کو چاہیے وہ سانپ ہو' بچھو ہو' کن کھجورا مارنا نہیں چاہیے۔ وہ خود بھی یہی عمل کرتے تھے جب بھی انہیں کوئی کیڑا نظر آتا وہ جلدی سے اسے بھگا دیتے کہ کہیں ہم اسے مار نہ دیں۔ جبکہ ہم مکڑیاں اپنے بیڈمنٹن کے ریکٹ سے مسل دیتے۔ اسی طرح دوسرے کیڑے بھی۔ کبھی کبھار کیڑے جمالی بابا کے ہاتھ لگ جاتے تو وہ ان کی مرہم پٹی بھی کیا کرتے تھے۔ ایک دن ہم نے ان سے کہا:

''جمالی بابا! اپنے اس سانپ کو سنبھال کر رکھیے۔ ہمیں جس دن نظر آ گیا ہم اسے چھوڑیں گے نہیں۔'' جمالی بابا کا غصہ اس وقت دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ لیکن بے چارے ملازم تھے گھر کے کیا کہتے۔ ہم لوگ تو ہر وقت جمالی بابا کو نیچا دکھانے میں لگے رہا کرتے تھے۔ ایک دن ہم نے ان کے اس دوست کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ برسات کا موسم تھا۔ رات کو بجلی کی گرج کے ساتھ ساتھ زوروں کی بارش ہو گئی تھی۔ گرمیوں کی اُبلتی ہوئی دُھوپ سے سُوکھی اور خشک زمین میں جان پڑ گئی تھی۔ پانی کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں سے مینڈکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کیچڑ بھری زمین ہر طرف کیڑے مکوڑے اور بیر بوٹیاں منڈلانے لگیں تھیں۔ ویسے بھی برسات کا موسم تھا اور لاہور کے سنت نگر کے بڑے بڑے مکانوں میں جہاں مکانوں کے صحنوں میں کھیت کے کھیت اگے ہوتے ہیں بارش کے اس موسم میں فطرت گھاس سے نمودار

ہو گئی تھی۔ کیلے کے سبز پتوں کا رنگ نکل آیا تھا۔ ہم نے اس کالے رنگ کے ناگ کو صحن کے آخری حصے میں بیٹھے دیکھا اس کا کالا چکنا پھن چمک رہا تھا۔ پھن بہت بڑا تھا۔ جس میں تقریباً چھ فٹ لمبا جس کی گولائی میری کلائی کے برابر تھی۔

بس پھر کیا تھا گھیر لیا ہم لوگوں نے مل کر اسے ویسے بھی کالج جانے والے تھے اور پوری طرح تیار تھے۔ فرش چکنا تھا۔ اور سارے بلوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ ہم نے سانپ کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اسے لمبی لمبی لاٹھیوں کے ساتھ گھیر لیا۔

سانپ کی خونخوار چمکدار آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ وہ بری طرح پھنکار رہا تھا اور ادھر ادھر بجلی کی سی تیزی سے اپنے آپ کو جنبش دے رہا تھا پھر وہ اچانک کیلے کے درخت کی طرف لپکا زمین چونکہ کیچڑ سے بھری ہوئی تھی اسی لیے اسے تیز رفتاری میں دقت ہو رہی تھی۔ کوئی سات آٹھ گز کا فاصلہ اس نے طے کیا تھا کہ ایک لاٹھی اس کے جسم پر پڑی اور اس کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بس پھر تو اس پر اتنے ڈنڈے پڑے کہ کچھ ہی دیر کے بعد اس کا سفید اور کالا کچلا ہوا جسم مٹی اور خون میں لت پت پڑا ہوا تھا۔ البتہ اس کا سر نہیں کچلا گیا تھا۔ میں نے کہا۔

''خبردار اس کا سر نہ کچلنا۔ ہم اسے کالج لے جائیں گے اور ٹیچر کو تحفے کے طور پر پیش کریں گے۔ اتنا بڑا ناگ تو ٹیچر نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہوگا۔''

''ذرا دیکھو تو سہی آس پاس جمالی بابا تو موجود نہیں ہیں۔ سو فیصدی یہ ان کا وہی دوست سانپ ہے''۔ جمالی بابا اس وقت واقعی ہی موجود نہیں تھے۔ چنانچہ ہم نے سانپ کو ایک ڈبے میں ڈالا اور ڈوری سے اچھی طرح باندھ دیا۔

بہرحال اس کے بعد جب ہم ڈبہ اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھے تو جمالی بابا سامنے آگئے میں نے تو خیر کچھ نہیں کہا تھا لیکن شہزاد کی زبان کہاں رکتی تھی۔ اس نے جمالی بابا کو ڈبہ دکھاتے ہوئے کہا:

''آپ کا دوست اس میں بند ہے جمالی بابا! اب ہم اسے اسپرٹ میں نہلائیں گے۔'' جمالی بابا پتھرا کر رہ گئے تھے۔ پھر جب ہم نے اسکول میں اس ڈبے کو کھولا تو اسکول میں ہلچل مچ گئی۔ ہم چار بھائی تھے اور اسکول کے سب سے نٹ کھٹ لڑکے تھے۔ ایک بار پھر ہم نے اپنی طاقت کا ثبوت دیا تھا۔ کالا ناگ اور وہ بھی چھ فٹ لمبا۔ ڈبہ سائنس کی ٹیچر کو پیش کیا گیا اور ٹیچر نے احتیاط سے ڈبہ میز پر رکھ لیا۔

بہرحال کچھ دیر کے بعد ٹیچر ایک مرتبان اور چمٹا لے کر آئے۔ اور انہوں نے ڈبے پر لپٹی ہوئی ڈوری کھولی۔ ڈوری جیسے ہی کھلی ڈھکنا ہوا میں اڑ گیا۔ کالے ناگ کی آنکھیں سرخ انگارے کی طرح جل رہی تھیں اور اسکا پھن تنا ہوا تھا وہ ایک زور دار پھنکار کے ساتھ ٹیچر کے چہرے کی طرف لپکا۔ ٹیچر نے بدحواسی سے اپنی کرسی پیچھے کی۔ کرسی الٹ گئی۔ ٹیچر زمین پر پڑے بڑے دہشت زدہ نگاہوں سے سانپ کو دیکھ رہے تھے۔ لڑکے ڈیسکوں پر چڑھ گئے اور چیخیں مارنے لگے۔ کالے ناگ کی زبان غیض وغضب سے لپلپا رہی تھی۔ وہ ڈبے سے باہر آنے کی کوشش میں زمین پر دھڑم سے گر پڑا اس کی پیٹھ کئی جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی تکلیف سے اپنے آپ کو دروازے کی طرف گھسیٹا اور جب وہ دہلیز پر پہنچا تو پھر خطرے کے اندیشے سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی کلاس کے دروازے پر آ گیا تھا۔ اور جب ہم نے ادھر دیکھا تو ہم حیران رہ گئے۔

جمالی بابا تھے جو حیران پریشان کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کالے ناگ کو دیکھا اور دردمندی سے گھٹنوں کے بل جھک گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ غصے سے بل کھاتا ہوا ناگ انہیں جگہ جگہ سے ڈسے گا۔ لیکن جمالی بابا نے ناگ کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ پھر اپنے کرتے کا دامن اس کے لیے کھول دیا۔ کالا ناگ غصے سے پھنکار رہا تھا لیکن

ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جمالی بابا سے اپنا دکھ بیان کر رہا ہو۔ جمالو بابا نے اسے اپنے دامن میں سمیٹا ایک نگاہ ہم پر ڈالی اور اس کے بعد وہاں سے چلے گئے۔

لیکن وہ گھر واپس نہیں آئے تھے اس کے بعد سے آج تک ان کا پتہ نہیں چل سکا۔ ہمیں جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے۔ ہمارا دل دکھ میں ڈوب جاتا ہے۔ کیا ایسے موذی جانوروں سے بھی انسان کی اتنی گہری دوستی ہو سکتی ہے۔

ختم شد

ضرورت اور محبت

رجب علی نے لال پگڑی سر سے اتاری' لاٹ کوٹ بھی اتارا اور دونوں چیزوں کو لپیٹ کر بغل میں دبایا اور تھکے ہارے انداز میں گردن جھکائے ریلوے اسٹیشن سے باہر جانے والے راستے کی جانب چل پڑا۔ تیز رَو کی روشنی اب نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ پلیٹ فارم کی گھڑی ساڑھے تین بجا رہی تھی' اب اس کے بعد قلیوں کی چھٹی تھی کیونکہ دوسری گاڑی ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے اس اسٹیشن پر نہیں رکتی تھی۔ صبح آٹھ بجے اسے یہاں پلیٹ فارم پر پہنچ جانا تھا' چھوٹا سا جھونپڑا ریلوے اسٹیشن سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر تھا۔

گھر پہنچا تو مریم جاگ رہی تھی' بچے سو رہے تھے۔ دوسرے کمرے سے سدو کی آواز آ رہی تھی۔

''ہاپا ہاؤ...... ہاپا ہاؤ...... ہاپا ہاؤ......'' ایک خوفناک ردھم تھی اس آواز میں' مریم کو اُس نے دیکھا تو وہ مدہم لہجے میں بولا۔

''کتنا کہتا ہوں تجھ سے کہ سو جایا کر...... یہاں کون سے زیورات رکھے ہوئے ہیں کہ کوئی چور چرا کر لے جائے گا۔''

''دروازہ کھلا چھوڑ دیا کر، پر مانتی ہی نہیں ہے، روز یہی کرتی ہے اور روز میں یہی کہتا ہوں۔''

''روز کہاں جاگتی ہوں، سو تو جاتی ہوں، بس یہ ہاپا ہاؤ، ہاپا ہاؤ جگاتی رہتی ہے کچھ کھاؤ گے؟''

''نہیں...... گھر سے روٹی کھا کر گیا تھا، سینے پر رکھی ہوئی ہے، ہاضمہ خراب سے خراب ہوتا جارہا ہے۔''

''چورن بنوا لو کسی حکیم سے ہاضمے کا۔''

''ہاں بنوا لوں گا۔'' رجب علی نے افسردگی سے کہا۔

زندگی کے بارے میں وہ اکثر سوچتا تھا۔ خاص طور سے ریلوے کی چمکتی ہوئی پٹڑیوں کو دیکھ کر نجانے کیوں اس کے ذہن میں ماضی کی ریل سی چل جاتی تھی۔ کیا ہوتی ہے یہ دنیا۔ ماں باپ اولاد پیدا کرتے ہیں اپنی خواہشوں اپنی خوشی کے لیے لیکن کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوتی، بعد میں یہ اولاد بڑی اولاد کے سر پڑ جاتی ہے اور اس کی زندگی عذاب بن کر رہ جاتی ہے، اور پھر یہ ہاپا ہاؤ۔ سدو، بچپن ہی سے پاگل تھی۔ پیدائش ہی ایسی تھی، اللہ نے زندگی دے دی۔ اسی ہاپا ہاؤ میں پوری زندگی گزر گئی۔ ماں باپ بھلا اس کے پاگل پن کا کیا علاج کراتے، حیرت کی بات ہے کہ دولت تو اندھی ہوتی ہی ہے، جوانی اس سے بھی زیادہ اندھی ہوتی ہے، سوچے سمجھے بغیر ہر ایک پر آ جاتی ہے، سدو پر بھی جوانی آ گئی تھی اپنی تمام لطافتوں کے ساتھ، پورا وجود ہی دلکش تھا، سر کے بال اتنے لمبے اتنے خوبصورت کہ اکثر عورتیں انہیں دیکھ کر رشک کرتی تھیں اور کہتی تھیں۔

''ہائے اللہ اس پاگل کو ایسے بال دینے کی کیا ضرورت تھی، ہر وقت چھتری بنائے نچاتی رہتی ہے۔''

ہاں سدو پاگل تھی، بچپن ہی سے پاگل تھی، ماں باپ مر گئے تھے اور اس کی جوانی اور دیوانگی بھائی کو ہی سنبھالنی پڑ رہی تھی۔ بدنصیبی سے شادی بھی ہو گئی تھی، سدو کے علاج کے پیسے کہاں سے آتے، قلی گیری میں ملتا ہی کیا، بس ہانڈی روٹی چل جاتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی تو قرض بھی لینا پڑتا تھا۔ اکثر وہ ریل کی چمکدار پٹڑیوں کو دیکھ کر سوچتا کہ کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں اس دنیا میں جن کے پاس دولت کا ٹھکانہ نہیں ہوتا، ایک ہم ہیں کہ بچے اگر کوئی چیز مانگتے ہیں تو اس کے لیے ہزاروں بہانے بنانے پڑتے ہیں، نہیں بیٹے! گلا خراب ہو جائے گا، یہ تو نقصان دیتی ہے، کھانسی ہو جائے گی، لیکن گلا خراب ہوتا تھا نہ کھانسی، بس پیسے نہیں ہوتے تھے۔ مولوی اسلام نے کہا۔

''رجب علی سائیں سرکار آئی ہوئی ہیں۔''

''سائیں سرکار......''

''ہاں بہت بڑی سرکار ہیں، سال بھر پہلے آئی تھیں، بہت سوں کو کچھ نہ کچھ دے کر گئیں، سب کی مرادیں پوری ہوئیں۔ بے اولادوں کے بیٹے پیدا ہوئے، بے روزگاروں کو روزگار مل گئے، تم بھی سدو کو لے کر سائیں سرکار کے پاس چلے جاؤ، دعا کر دیں گے تو بیڑا پار ہو جائے گا۔''

کتنی خواہش تھی رجب علی کے دل میں کہ بچپن سے جس معصوم وجود کو سینے پر بٹھا کر پالا تھا، ٹھیک ہو کر ہنسے اور کہے کہ بھائی تم نے مجھ پر بڑی محنت کی۔ تمہاری محنت بارآور ہو گئی۔ کبھی کبھی دل چاہتا کہ سدو کو چلتی ہوئی ریل کے سامنے دھکا دے دے، اخراجات سے بچ جائے گا اور گھر میں سکون کی نیند بھی حاصل ہو جائے گی۔ مریم ہر وقت اپنے آپ کو بھی اسے بھی بچوں کو کوستی رہتی تھی، سدو کی ہاپا ہاؤ نے واقعی دماغ میں سوراخ کر دیئے تھے۔

سائیں سرکار کے حضور جا پہنچا' بہن کے لیے دعا کرانے گیا تھا۔ سائیں سرکار کہیں اور سے آتی تھیں۔ یہاں ان کا مجاور ایک آستانہ بنائے بیٹھا رہتا تھا' سال بھر عیش کرتا تھا۔ سال پیچھے سائیں سرکار آتیں تو کمائی شروع ہو جاتی۔ نجانے کہاں کہاں سے لوگ آتے' گاڑیاں آتیں' مٹھائیاں چڑھاوے' سائیں سرکار اس وقت بھی سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سر کے بال چھتری کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ چہرے پر بالکل ویسی ہی دیوانگی تھی جیسی سدو کے چہرے پر ہوا کرتی تھی' مجاور لوگوں سے ان کے مسائل پوچھتا' سائیں سرکار کے سامنے پانچ سو گیارہ روپے رکھے جاتے' سائیں سرکار بس گردن ہلاتی رہتیں' بالکل ایسے ہی جیسے ایک بار اس نے اس نقلی کتے کی گردن ہلتی ہوئی دیکھی تھی' جو ایک صاحب کی کار کے پچھلے حصے میں رکھا ہوا تھا۔

سائیں سرکار کی گردن ہاہا ہاؤ کے انداز میں ہی ہلتی تھی' کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک رجب علی سائیں سرکار کے دربار میں بیٹھا رہا۔ وہ نوٹ اور مٹھائیوں کے انبار لگے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر اسے نجانے کیا سوجھی کہ چپکے سے اپنی جگہ سے اٹھا اور وہاں سے کھسک لیا۔ گھر پہنچا تو مریم نے سوال کیا۔

''ملے سائیں سرکار سے......؟''

''زبان بند رکھ' وہ تو بالکل اپنی سدو جیسی ہے' نوٹوں کے انبار جمع ہوئے جا رہے ہیں' مریم ......کل سے ایک کام کرنا ہے۔''

''ہاں بولو۔''

''مریم سائیں سرکار ہے' تو نے رات کو خواب دیکھا' پھر میں نے دیکھا اور اس کے بعد گھر میں خوشبو آنے لگی' سدو ٹھیک ہو گئی تو ہماری دنیا نہیں بدلے گی' کل سے سدو سائیں سرکار کا روپ ہو گی۔

اور اب رجب علی کا اسی ریلوے کالونی میں ایک خوبصورت سا گھر ہے' اس کے گھر پر عقیدت مند آتے ہیں' یہاں بہت سے بڑے بڑے جھنڈے لگے ہوئے ہیں' باہر پانی کی سبیلیں ہیں۔ رجب علی مجاور ہے' اور سدو سائیں سرکار۔ اچھی گزر رہی ہے' پتہ نہیں ضرورت اور محبت دونوں میں سے کونسی چیز زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

ختم شد

سولی

مصیبت واقعی بتا کرنہیں آتی' میرے ہاں بھی مصیبت بتا کرنہیں آئی تھی' یعنی میری ساس' میری بیوی کی ماں حالانکہ اگر ہمارے گھر کوئی مہمان آجائے تو میں اس سے ہرگز نہیں چڑتا بلکہ مہمان نوازی کر کے خوش ہوتا ہوں اور پھر وہ تو میری ساس تھی' لیکن ساس کے بارے میں پچھلے کچھ تجربات زیادہ اچھے نہیں تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ بڑی بی بہت زیادہ پڑھی لکھی تھیں اور ہر بات میں منطق جھاڑتی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ ان کی آنکھوں میں ایک ایسی مکاری رچی ہوئی تھی جو میں بُری طرح محسوس کرتا تھا لیکن کبھی اظہار نہیں کر پاتا تھا' چونکہ نیلا بذات خود اچھی لڑکی تھی' بہرحال میں ان سے اچھی ہی طرح ملا لیکن میرا دل اندر سے کہہ رہا تھا کہ دیکھو یہ مصیبت کب تک رہتی ہے۔

ٹی وی والے کمرے میں محترمہ ٹی وی کے سامنے براجمان تھیں' مجھ سے بڑی لپک کر ملیں اور پھر مختصر باتیں کرنے کے بعد پھر ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہوگئیں۔ اپنے پسندیدہ پروگرام دیکھنے کے ساتھ ساتھ ہی انہوں نے کچھ کھانے پینے کی فرمائشیں بھی کر دی تھیں' نیلا یہ بات جانتی تھی کہ میں ذہنی طور پر بڑی بی کو دیکھ کر نروس ہوجاتا

ہوں' بڑی بی نے مجھ سے ملاقات کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں میرے بیٹے' تین سو میل کا سفر میں نے تمہی لوگوں کے لیے کیا ہے' بس میں بیٹھے بیٹھے میری تو ٹانگیں دکھ گئیں' بہرحال پہنچ ہی گئی تمہارے پاس کسی نہ کسی طرح' ظاہر ہے اپنے بچوں میں نہ آتی تو اور کہاں جاتی۔''

''آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے؟''

''لو تمہیں کیوں نہیں بتاؤں گی' اچھا اب تم ایسا کرو میرا بستر یہیں لگوا دو' جب تک دل چاہے گا ٹی وی دیکھوں گی اور اس کے بعد یہیں سو جاؤں گی اور ہاں جب میں سو جاؤں تو براہ کرم کوئی شور شرابہ نہ ہو۔''

میں نے بے بسی کی نگاہوں سے نیلا کو دیکھا لیکن نیلا کسی اور طرف دیکھ رہی تھی رات کو اس نے بتایا۔

''امی کے آنے سے گھر کی رونق کتنی بڑھ گئی ہے' بس کیا کہا جائے' بہو بیٹے گھر رکھنے پر تیار نہیں ہیں' امی نے وہ گھر چھوڑ ہی دیا۔''

''کیا؟''

''ہاں...... اتنا تنگ کیا انہوں نے' وہاں سے یہاں آگئیں۔''

میں دم گھونٹ کر رہ گیا تھا۔ بہرحال ساس محترمہ نے اپنے پنجے پھیلانا شروع کر دیئے' صبح کو ناشتے کی میز پر بولیں۔

''ڈاکٹر کہتا ہے میرا جگر خراب ہے' پرہیز کے طور پر جب سے میں نے بغیر نمک کے کھانا کھانا شروع کر دیا ہے بہت ٹھیک رہتی ہوں' اب حالت یہ ہے کہ کھانے میں نمک دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔''

میں فرائی انڈے پر نمک چھڑکنے ہی والا تھا کہ ساس صاحبہ نے نمک دانی ہاتھ سے لے لی۔

''ہرگز نہیں تم اسی طرح انڈا کھانے کی عادت ڈالو۔''

بہرحال میں جانتا تھا کہ میری مصیبت بغیر کہے ہوئے آئی ہے' سگریٹ سلگائی تو ساس صاحبہ نے جھپٹا مار کر سگریٹ میرے منہ سے نکالی۔

''پچھلی بار جب میری تم سے ملاقات ہوئی تھی تو تم نے وعدہ کیا تھا کہ سگریٹ چھوڑ دو گے' دیکھو اب تم سگریٹ نہیں پیو گے۔''

''آپ سمجھنے کی کوشش کریں میں بغیر سگریٹ کے......''

''ہرگز نہیں ہرگز نہیں' میں بزرگ ہوں۔''

دوسری رات میں نے نیلا سے کہا۔ ''نیلا ایک مسئلہ بڑا خراب ہے' تھوڑے بہت دنوں کی بات تو کچھ بھی نہیں تھی لیکن مستقل یہاں قیام......''

''اب کیا کیا جائے' نکال تو نہیں سکتی۔''

''ہر بات میں دخل اندازی کے لئے منع تو کر سکتی ہو۔''

''کوشش کروں گی۔''

لیکن نیلا کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی' ٹیلی ویژن پر ہم اپنی پسند کا پروگرام دیکھنے کو ترس گئے۔ تین دن کے بعد ساس صاحبہ نے کچن سنبھال لیا۔

''اب میں یہاں رہوں گی تو ظاہر ہے ہاتھ پاؤں بھی ہلاؤں گی' کھانا میں پکاؤں گی اور خبردار گھر میں گوشت کا نام بھی نہ لیا جائے' اور سنو چائے کافی سے زیادہ بہتر ہے' میں نے کافی باہر پھینک دی ہے' یہاں صرف چائے پی جائے گی۔'' بہرحال یہ ہنگامہ آرائی جاری رہی۔

کھانے پر نجانے کیا کیا الائیں بلائیں آجاتی تھیں' مٹھائی کا نام و نشان نہیں رہتا تھا' بڑی بی کی آنکھوں میں ایک الگ مکاری نظر آتی تھی اور میں اس مکاری کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دفتر میں بھی بری طرح اپ سیٹ رہتا تھا' بہرحال یہ سارا

چکر چلتا رہا اور ایک دن میں بڑی بی پر برس پڑا۔

''آپ بزرگ ہیں' گھر کے معاملات میں اتنا دخل نہ دیا کریں' اور پھر مائیں تو بیٹیوں کے گھر نہیں رہتیں' آپ نجانے کیسی ماں ہیں۔''

''بیٹے اپنی جگہ خود بنائی جاتی ہے' مجھے تھوڑا سا موقع دو' میں یہ ثابت کر دوں گی کہ میں اس گھر کے لیے بہت ضروری ہوں۔''

اور میری بدقسمتی نے بڑی بی کو یہ ثابت کرنے کا موقع دے دیا۔ زاہد میرا دوست تھا' دفتر سے پچاس ہزار روپے غبن کر کے بھاگا تھا' لیکن اس طرح سے کہ سارا الزام میرے سر پر آیا تھا اور میں نے اس کا نام تک نہیں لیا تھا' خاموشی سے تھوڑی تھوڑی کر کے یہ رقم کٹوا دی تھی لیکن میرے دل میں اس کے لیے شدید نفرت تھی اور اس دن وہ اچانک ہی آ گیا تھا' نیلا بازار شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھی' ساس صاحبہ گھر میں تھیں' زاہد کو دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا' میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا تو اس نے زور سے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''تمیز سیکھو تمیز...... میں تمہیں بتانے آیا ہوں......''

''تمیز کے بچے! تو نے جس طرح مجھے پھنسایا ہے' اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔''

''صرف ایک منٹ سنو اور میری بات سنو۔'' وہ بولا لیکن میں بری طرح غصے میں آ گیا تھا' میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر زور سے دھکا دیا' زمین چکنی تھی یا خود اس کا پاؤں پھسل گیا تھا' وہ گرا اور اس کا سر آتشدان سے ٹکرایا اور وہ اس کے بعد نہ اُٹھا' دوسرے لمحے مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ مر چکا ہے' میں سناٹے میں رہ گیا تھا اور اسی وقت مجھے ساس صاحبہ کی آواز سنائی دی۔

''قتل کر دیا نا تم نے اسے' میں سب کچھ دیکھ چکی ہوں' تم مجھے نہیں دیکھ رہے

تھے، لیکن میں تم دونوں کو دیکھ رہی تھی، اوہ ...... کیا حسین نوجوان ہے۔'' میرے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے، ساس صاحبہ نے کہا۔

''سنو...... اگر تم چاہو تو نیلا کے آنے سے پہلے اسے ٹھکانے لگا سکتے ہو، لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا اگر مجھ سے ذرا بھی منحرف ہوئے تو پھر پولیس کو جو تفصیل بتائی جائے گی وہ بڑی جامع ہوگی اور نتیجے میں تمہیں سزائے موت ہو سکتی ہے۔ چلو جتنی دیر کرو گے اتنا ہی تمہارے حق میں نقصان دہ ہوگا۔''

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا، یہ قتل نادانستگی میں مجھ سے ہوا تھا، لاش تو میں نے ٹھکانے لگا دی لیکن اب بغیر نمک کا سالن کھانا پڑتا ہے، سگریٹ چھوڑ دی ہے، ٹی وی کے پروگرام نہیں دیکھتا، نیلا کو اس بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم، لیکن بڑی بی کی آنکھوں کی مکاری مجھے بتاتی رہتی ہے کہ جس دن پٹڑی سے اُترا سولی پر چڑھ جاؤں گا۔

ذرا سی غلطی

ایک دلچسپ تجربہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہی ہوں۔ معاشی مجبوریوں کے باعث میں بھی انہی لڑکیوں میں سے ہوں جن کو دن میں دو بار کام پر جانے اور آنے کے لیے بس پر سفر کرنا پڑتا ہے۔ میرا تجربہ خاصا طویل ہے۔ دفتر جاتے ہوئے تو عام طور سے تنہا ہی ہوتی ہوں۔ لیکن واپسی پر اکثر و بیشتر میرے ساتھ ایک نہ ایک خاتون یا لڑکی ہوتی ہے۔ میں قد میں لمبی ہوں لیکن دبلی نہیں کہی جا سکتی۔ میرا رنگ نہ بہت گورا ہے اور نہ ہی کالا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ میری آنکھیں بھی مناسب ہی ہیں۔ یہ رائے جو میں نے اپنے بارے میں درج کی ہے محتاط قسم کی ہے۔ مگر کیونکہ میں مردوں کی نفسیات پر تبصرہ کرنا چاہتی ہوں۔ اس لیے یہ تفصیلات بتانا ضروری تھا۔ آپ خود بھی یقیناً کسی حد تک واقف ہوں گے کہ مردوں کی یہ عادت ہی ہے کہ بس میں چڑھتے ہوئے جلدی سے تمام بس کا جائزہ لے لیتے ہیں اور عورتوں کے چہرے خاص طور سے ان کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کسی نہ کسی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔

میں عرصے سے ان عادات کا مشاہدہ کر رہی ہوں اور اتنا تجربہ ہو چکا ہے کہ پہلی ہی نگاہ میں آنے والے اشخاص کو تاڑ جاتی ہوں۔ کون سنجیدہ مزاج ہے، کون

کھلنڈرا' کون اُجڈ ہے اور کون آوارہ گرد اور اتنے عرصے کے بعد فوراً پتہ چل ہی جاتا ہے۔ ایک لمحے کے اندر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون کون خواتین کی قربت کا خواہاں ہے اور کون علیحدہ رہنا پسند کرے گا۔ ان حالات میں بدقسمتی سے جب میرے قریب والی نشست خالی ہوتی ہے تو میں اپنی طرف آنے والے کسی بھی شخص کو بخوبی پہچان لیتی ہوں اور مجھے اس کے بارے میں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون الگ بیٹھے کا اور کون نیم لاپرواہی کا مظاہرہ کرے گا۔ اور وہ کون ہوگا جو نشستوں کو پھلانگتا ہوا وہیں آ کر جمے گا۔ جہاں میں بیٹھی ہوئی ہوں۔ مردوں کی اقسام میں یہ آخری قسم والے افراد ہمیشہ میری دلچسپی کا باعث بنے رہے ہیں۔ ایسے افراد سے سامنا کرتے وقت میں اکثر کھڑکی کی طرف سرک جاتی ہوں۔ تا کہ آنے والا اطمینان سے بیٹھ جائے۔

میرے نزدیک بیٹھ کر ایسے اشخاص کچھ دیر تک بظاہر خاصے متفکر نظر آتے ہیں لیکن یہ باتیں دکھاوا ہوتی ہیں۔ کیونکہ کچھ لمحوں کے بعد وہ نگاہیں گھماتے ہیں اور قریب بیٹھی ہوئی لڑکی کو گھورتے ضرور ہیں۔ کبھی کبھی انہیں دوسروں کی نگاہوں کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے اور وہ محتاط ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے انہیں کسی لڑکی کی قربت کا احساس ہی نہ ہو۔ حالانکہ اس کے دماغ میں اس وقت صرف وہی لڑکی گھوم رہی ہوتی ہے۔ پھر انتہائی آہستگی اور احتیاط سے اپنا دایاں پاؤں کھڑکی کی سمت کرتے ہیں۔

بہر حال ہوسکتا ہے آپ میری ذہنیت پر شک کرنے لگیں لیکن ان لمحات میں مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ میں ایسے کسی شخص کے بارے میں اچھی طرح اندازہ لگا لیتی ہوں اور اس کے لیے اپنے تحفظ کے طریقوں کو استعمال میں لے آتی ہوں۔ کیونکہ شریف اور بدمعاش سب کے لیے یکساں طریقے مناسب نہیں ہوتے۔ یہ

حرکت ہر طبقے کے افراد میں کثرت سے پائی جاتی ہے اور اس کی ابتداء اور انتہا دونوں اشخاص یکساں طریقوں سے کرتے ہیں۔ یعنی پہلے تو بے تعلقی اور پھر ذرا دیر کے لیے اپنے پیروں پر ایک اچٹتی نظر ڈالی جاتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اور میرے پیروں کے درمیان کے فاصلے کا اندازہ کر سکیں اور اس کے بعد وہ مہم جوئی شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے ایسے افراد سے قربت کی خوشی کی بات کہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا مہم آزما وہ دوست اپنی مہم کا آغاز کرتا ہے اور میں اپنی تحفظانہ کارروائی میں لگ جاتی ہوں۔ قطعی توجہ دیئے بغیر کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوئی میں اپنا دایاں یا بایاں ہاتھ محتاط انداز میں سرکانا شروع کر دیتی ہوں۔ اس طرح کے میرے جسم کی خفیف سی جنبش کا بھی کسی کو احساس نہ ہو سکے۔ پھر جب ہمارا ہمسفر دوست اپنے اندازے کے مطابق اپنا پیر وہاں تک کھسکا چکا ہوتا ہے۔ جہاں اس کے خیال میں میرے پیر کو موجود ہونا چاہیے تو وہ گھبرا جاتا ہے کیونکہ خلاف توقع اسے وہاں میرا پیر نہیں ملتا۔ یہ اس کے لیے ایک ذہنی جھٹکا ہوتا ہے۔ وہ فوراً اپنی نظریں فرش پر جما دیتا ہے اور پھر میری طرف دیکھتا ہے۔ میں بہر حال اس بات کے بعد اس طرح کھو جاتی ہوں جیسے کوئی بات میرے ذہن میں ہی نا ہو۔

خیر اس کے بعد ہمسفر اپنا رویہ ترک کر کے اللہ پر بھروسہ کرتا ہے اور خاموش بیٹھ جاتا ہے۔ بہر حال یہ میرا طریقہ کار ہے البتہ دو کیسوں میں ذرا سخت رویہ اختیار کرنا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں صرف ایک تنبیہ آمیز نگاہ کافی ہوتی ہے۔ براہ راست آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے سے گریز کرنا ہی اچھا رہتا ہے اور بہر حال کچھ ایسا ہی حال ان جوان عمر خواتین کا بھی ہوتا ہے۔ جو سانولی ہوتی ہیں نا گوری۔ نہ لمبی ہوتی ہیں نا ٹھگنی۔ جن کی آنکھیں بڑی ہوتی ہیں نہ چھوٹی۔ جن کے ہونٹ موٹے ہوتے ہیں نا پتلے۔

بہرحال وہ جو کہتے ہیں نا کہ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔ اس پورے تجربے کے دوران ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ اپنا پیر کھسکانے کو جی نہ چاہا۔ اور وہیں رکھا رہنے دیا۔ بس وہی ایک غلطی ہو گئی تھی۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا۔ صرف ایک بار واقعی اس لمحے میں' میں نے اپنے اندر توانائی کی کمی محسوس کی تھی کہ میں اپنا پیر کھسکا سکوں اور بس آج میں اس شخص کی بیوی ہوں۔ ذرا سی غلطی کا اندازہ ہے آپ کو کہ اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں؟

ختم شد

مسکن

میرے شوہر فوج میں ملازم ہیں۔ اس زمانے میں ہم لاہور چھاؤنی میں مقیم تھے۔ ہمیں جو رہائش گاہ ملی ہوئی تھی وہ آبادی سے دور چھاؤنی کے آخری سرے پر بہت ہی پرانی اور اونچی سی بلڈنگ پر مشتمل تھی۔ اس قدیم کھنڈرات نما کوٹھی کے چاروں طرف وسیع لان بھی تھے جن میں اونچے اونچے گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔

پہلے پہل تو مجھے اس کوٹھی میں بہت ڈر لگتا تھا۔ پھر فوجی افسروں کی بیویوں سے میل ملاپ کے ہنگاموں میں یہ خوف دور ہوتا چلا گیا۔ دو تین مہینے بڑے چین سے کٹے۔ لیکن پھر ایک رات ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے خوف سے آج بھی لرز اٹھتی ہوں۔ اس رات بہار کے خوشگوار جھونکے نیند نہ آنے کا سبب بنے ہوئے تھے۔ میرے شوہر گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ میں دوپہر کو بھی دیر تک سوئی تھی اس لیے اب بالکونی میں کھڑی وسیع لان کو تک رہی تھی۔ حتیٰ کہ رات کے بارہ بج گئے۔ تھک کر بستر پر آ لیٹی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اکتا کر چھت کی ٹائلیں گننی شروع کر دیں۔ اسی وقت مجھے لگا کہ باریک باریک گھنگھروؤں کی صدا ماحول میں رچتی جا رہی ہے۔ میرے نزدیک یہ باہر کی دیوی کا رقص تھا یعنی خوشگوار ہوا پتوں میں

اٹھکھیلیاں کر رہی تھی اس لیے اس جھنکار کو زیادہ اہمیت نہ دی۔

چاندنی رات تھی اور روشندان سے روپہلی کرنیں کمرے کو دودھیا بنائے ہوئے تھیں۔ ماحول کچھ ایسا دلفریب اور پراسرار تھا کہ چھن چھن کی یہ صدا مجھے بڑی بھلی لگی میں نے گہرا سانس لیا اور کروٹ بدلی اور میں نے جو منظر دیکھا اسے دیکھ کر میری گھگی بندھ گئی۔ کوئی چار پانچ فٹ کے فاصلے پر ایک ٹھگنے سے قد کی دبلی پتلی عورت والہانہ انداز میں فرش پر گھوم رہی ہے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ یہ آواز پتوں کے اڑنے کی نہیں بلکہ اس عورت کے تھرکتے پاؤں کے گھنگھروؤں کی آواز تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مارے دہشت کے میرے دل کی حرکت ابھی بند ہو جائے گی۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں مگر وہ چھن چھن کرتی آواز میرے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھی۔ میں نے چاہا اپنے شوہر کو جگا دوں لیکن شدت خوف سے میرے حلق سے آواز ہی نہ نکل سکی۔ میں نے کچھ سوچ کر دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ بڑھایا تاکہ انہیں ہلا کر جگا دوں' میرا ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے ہٹا دیا گیا کیونکہ میری کلائی اس عورت کے ہاتھ میں تھی۔ میں بری طرح کانپنے لگی' اس عورت نے بھیانک انداز میں کہا۔

''اگر تو نے اسے جگایا تو تم دونوں کے لیے برا ہو گا۔'' پھر اس نے میرا ہاتھ کھینچا۔ ''چلو میرے ساتھ۔''

میں اپنی پوری طاقت سے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہ رہی تھی لیکن وہ گرفت اتنی مضبوط تھی جیسے مجھے رسی سے جکڑ دیا گیا ہو۔ میں پلنگ پر سے گھسٹتی چلی گئی۔

''خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ اللہ کے لیے مجھے چھوڑ دو۔'' میں نے اپنی پوری قوت صرف کر کے یہ آواز نکالی تھی لیکن مجھے یہ صرف سرگوشی ہی محسوس ہوئی تھی۔ اچانک میری نظر شیلف پر رکھے کلام پاک پر پڑی اور میں نے دل ہی دل میں قرآنی

آیات کا ورد شروع کر دیا۔ ان مقدس آیات کا پڑھنا تھا کہ اس عورت نے فوراً میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور پاگلوں کے سے انداز میں رقص کرنے لگی' دہشت سے میری آنکھیں ابلی جا رہی تھیں میں جلدی جلدی جو منہ میں آیات قرآنی آتی رہیں ان کا ورد کیے جا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ پراسرار بلا غائب ہو گئی۔ اسی وقت میری سسکی کی آواز سے میرے شوہر کی آنکھ کھل گئی' انہوں نے فوراً لائٹ جلائی' میں نے بڑی مشکل سے انہیں سارا واقعہ سنایا انہوں نے سارا گھر چھان مارا لیکن وہاں کچھ نہ ملا۔ صبح پتہ چلا کہ یہ مکان کسی ہندو رقاصہ کا تھا جو بلوؤں میں ماری گئی تھی۔

ختم شد

سینہ زوری

گارنٹی کی چیز تھی میں نے بڑی چاہت سے نفیسہ کو خرید کر دی تھی' یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارے حالات بہتر نہیں تھے' ایک بار گھڑیوں کی ایک دکان سے گزرتے ہوئے نفیسہ نے شوکیس میں لگی ہوئی اس گھڑی کو دیکھ کر کہا تھا۔

''آہ کتنی خوبصورت گھڑی ہے' یقیناً کسی خوش نصیب کے لیے بنائی گئی ہوگی۔''

بات معمولی سی تھی اور نفیسہ نے کسی طنز سے بھی نہیں کہی تھی' لیکن میرے دل میں بیٹھ گئی تھی اور جب اللہ نے مجھے اس قابل کیا تو میں نے ننھے ننھے ڈائمنڈز سے مرصع اس گھڑی کو نفیسہ کے لیے خرید لیا اور اسے اس کی سالگرہ کے دن تحفے میں پیش کر دیا' نفیسہ بے حد خوش ہوئی تھی' ویسے تو وہ بڑی نفیس طبیعت کی مالک تھی' اپنے نام کی طرح نفیس لیکن کبھی جب بگڑتی تو بس اتنی معمولی سی بات پر بگڑ جاتی' پتہ نہیں کیوں گھڑی چلتے چلتے رک گئی تھی اور نفیسہ نے بڑے افسوس سے مجھ سے کہا تھا کہ اتنی قیمتی گھڑی اور اس طرح رک جائے تعجب کی بات ہے۔''

''کوئی پریشانی کی بات نہیں اس کی تو بہت لمبی گارنٹی ہے' ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اسے خریدے ہوئے' میں اسے ٹھیک کرا لاؤں گا یا دکاندار بدل کر دے گا'

ہزاروں روپے کی مالیت کی ہے۔''

اور اس کے بعد میں حسب عادت گھڑی کو لے کر دکاندار تک نہ گیا' نفیسہ مجھ سے کہتی رہی' بات یہ نہیں تھی کہ میں جانا نہیں چاہتا تھا یا اس سے مخلص نہیں تھا لیکن بس میری مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ ہر بار گھڑی لے جانا بھول جاتا تھا۔ نفیسہ نے اب چڑ کر کہنا ہی چھوڑ دیا تھا' واقعی مجھے کتنی ہی بار اس سے شرمندگی ہوئی تھی ایک دن اس نے گھڑی کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔

''ایسی چیز جو کسی کام نہ آسکے بیکار ہی ہوتی ہے' آئندہ میں آپ سے بالکل نہیں کہوں گی۔''

''ارے ارے ارے...... بس آج کا دن اور دے دو' کل میں اسے ضرور اپنے ساتھ لے جاؤں گا' بلکہ میں ایسا کرتا ہوں کہ ابھی سے اسے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیتا ہوں' تاکہ مجھے یاد رہے اور بس کل آفس سے آتے وقت اسے ضرور دیتا ہوا آؤں گا۔'' میں نے گھڑی کوٹ میں رکھ دی۔

پھر دوسرے دن معمول کے مطابق میں آفس چل پڑا۔ نفیسہ نے گھڑی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی گھڑی میں نے کوٹ کی جیب میں رکھ لی تھی' بہر طور آفس پہنچا اور آفس پہنچنے کے بعد مصروفیات وہ پہاڑ کی مانند میرے اطراف احاطہ کر کے کھڑی ہو گئیں۔ ساڑھے تین بجے مجھے ایک دور کے کام سے جانا پڑا اور میں گاڑی لے کر چل پڑا۔ کوئی ساڑھے پانچ بجے تک آفس سے باہر اب اس کے بعد سیدھا یہاں سے گھر ہی جانا تھا' چنانچہ میں چل پڑا' گھڑی میرے ذہن سے بالکل محو ہو گئی تھی' جس سڑک پر میں یہ سفر کر رہا تھا وہ خاصی سنسان تھی' پھر میں نے سڑک کے درمیان ایک لڑکی کو ہاتھ اٹھائے کھڑے دیکھا۔ وہ مجھ سے لفٹ مانگ رہی تھی' میں نے کار کے بریکوں پر دباؤ ڈال دیا۔ فیشن

اپیل قسم کی لڑکی تھی' خوبصورت لباس میں ملبوس' ہاتھ میں پرس لئے۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ بڑی عاجزی سے بولی۔

''معافی چاہتی ہوں جناب' شہر کے ابتدائی سرے پر مجھے اتار دیجئے۔''

''آیئے بیٹھ جایئے۔'' میں نے کہا اور وہ میرے برابر والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی' میں نے کار آگے بڑھا دی' ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

''لیکن بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے' اس سنسان اور تنہا سڑک پر آپ۔''

''بس میری دوست شرارت میں مجھے اتار کر چلی گئیں۔ کچھ ایسی ہی باتیں ہوئی تھیں ان سے میں نے مذاق ہی میں کہا تھا کہ لڑکیوں کو عموماً لفٹ مل جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے ہم تمہارا انتظار کریں گے۔''

''مگر عجیب مذاق ہے۔ ادھر سے تو کوئی پرائیویٹ بس یا ٹیکسی بھی نہیں گزرتی''

''مجھے یقین تھا ابھی دن کا خاصہ حصہ باقی ہے۔ کوئی نہ کوئی گاڑی مجھے شہر تک راستہ دے دے گی۔''

میں خاموش ہو گیا' بہرحال مجھے گھر جانا تھا لڑکی کو شہر کے ابتدائی سرے پر اتار کر سیدھا گھر جاؤں گا' اس نے بہت ہی عمدہ قسم کی خوشبو لگائی ہوئی تھی جو مجھے پسند آئی' ایک لمحے کے لیے میرا دل چاہا کہ اس سے اس کی خوشبو کے بارے میں پوچھوں۔ لیکن پھر سوچا کہ کہیں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے۔ اچانک ہی مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا لڑکی نے کئی بار ہلکے سے ہچکولے کے ساتھ میرے بدن کو چھوا تھا' مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے لباس کو ٹٹول رہی ہو' اور بے شمار خیالات میرے ذہن میں گردش کر گئے۔ اس طرح کی شکاری لڑکیاں جو خوبصورت بھی ہوتی ہیں' کبھی کبھی سڑکوں پر اس انداز میں بھی نظر آ جاتی ہیں' سو فیصدی اس لڑکی کا تعلق بھی ایسے ہی کسی

شکاری گروہ سے ہے۔

اچانک ہی میں اچھل پڑا' میری جیب میں تقریباً سولہ سترہ ہزار روپے کی مالیت کی ایک قیمتی گھڑی موجود تھی۔ مجھے فوراً ہی یاد آیا تھا کہ میں نے گھڑی کوٹ کی جیب میں رکھی تھی۔ بہرحال میں نے فوراً ہی اسٹیرنگ کو ایک ہاتھ سے سنبھالا اور کوٹ کی جیب کو ٹٹول کر دیکھا' گھڑی غائب تھی' میں نے فوراً ہی دوسری طرف کی جیب بھی ٹٹولی اور اس کے بعد میرے ہونٹ بھنچ گئے' میں نے کار کے بریکوں پر دباؤ ڈالا' ایک دم سے میرا ذہن غصے سے بھر گیا تھا' لڑکی چونک کر بولی۔

''کیا ہے کیا بات ہے؟''

میں نے کار سائیڈ کر کے روکی اور کہا۔ ''گھڑی واپس میری جیب میں رکھ دو۔''

''کیا۔'' وہ حیرت سے منہ کھول کر بولی۔

''سنا نہیں تم نے کیا چاہتی ہو' میں تمہیں پولیس اسٹیشن بھی لے جا سکتا ہوں اور یہاں بھی تمہارے ساتھ وہ سلوک کر سکتا ہوں کہ تم زندگی بھر یاد رکھو۔''

''لل...... لیکن جناب۔'' لڑکی پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

''سنا نہیں تم نے۔'' میں نے اس کی گردن کی جانب ہاتھ بڑھایا تو وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔

''مم...... مگر میری بب...... بات تو سنیئے۔''

''گھڑی واپس میری جیب میں رکھ دو سمجھیں تین تک گنتی گنتا ہوں اس کے بعد تمہاری شکل بگاڑ دوں گا اور گھڑی تم سے لے لوں گا سمجھیں۔''

''وہ میرا مطلب میری...... میری بات تو سنیئے۔''

''بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے کوٹ کی آستینیں چڑھائیں تو اس نے جلدی سے پرس کھولا اور گھڑی نکال کر میری جیب میں ڈال دی۔

''شرم نہیں آتی تم لوگوں کو' چلو نیچے اترو۔''

وہ مم...... مجھے۔

''نیچے اترو۔'' میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر کہا اور دروازہ کھول دیا۔ شرمندہ شرمندہ سی نیچے اتر گئی تھی۔ میں نے کوٹ کی جیب پر ہاتھ مار کر دیکھا' گھڑی کوٹ کی جیب میں موجود تھی' میں نے نفرت سے منہ سکوڑ کر دروازہ بند کیا اور پھر کار آگے بڑھا دی' شدید غصہ تھا دل میں اور میں سوچ رہا تھا کہ شرافت سے بڑی حماقت اور کوئی نہیں ہے۔ خاص طور سے لڑکیوں کے معاملے میں تو بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اگر وہ شہری آبادی میں داخل ہو جاتی تو پھر گھڑی اس سے لینا میرے بس کی بات نہیں تھی' بہرحال آج پھر گھڑی مرمت کے لیے جانے سے رہ گئی تھی' میں نے سوچا کہ گھڑی چھپا لوں گا اور نفیسہ سے یہی کہوں گا کہ وہ میں مرمت کے لیے دے آیا ہوں۔

گھر پہنچ کر میں نے لباس وغیرہ تبدیل کیا اور نفیسہ نے میرے سامنے چائے لگا دی' اس کے چہرے پر طنزیہ آثار تھے۔ میں نے اسے دیکھ کر کہا۔

''کیوں خیریت کیا بات ہے؟''

''وہ گھڑی کے بارے میں پوچھ رہی تھی آپ سے......''

''کیا پوچھ رہی تھیں وہ مرمت کے لیے جا چکی ہے۔ جناب۔'' نفیسہ زور سے ہنس پڑی پھر بولی۔

''چلئے کوئی بات نہیں ہے' لیکن آپ جھوٹ نہ بولیے۔''

مجھے شبہ ہوا کہ شاید اس نے گھڑی میری کوٹ کی جیب میں دیکھ لی ہے' اس نے گھڑی میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ مرحوم و مغفور گھڑی آپ اپنے کوٹ کی جیب میں ہی چھوڑ گئے تھے۔''

''چھوڑ گیا تھا۔''

''جی ہاں کوٹ تو دوسرا پہن کر گئے تھے نا آپ۔''

''کیا؟'' میں حیرت سے اچھل پڑا اور اس کے بعد میں نے اس ہینگر کی جانب چھلانگ لگائی جس پر میرا آج کا پہنا ہوا کوٹ لٹکا تھا' گھڑی کوٹ کی جیب میں موجود تھی لیکن یہ نفیسہ کی گھڑی نہیں تھی ایک بہت ہی خوبصورت چھوٹی سی زنانہ گھڑی جو میں اس لڑکی سے لے آیا تھا۔ لیکن وہ نفیسہ کی گھڑی نہیں تھی۔

ختم شد

گرائمر کی غلطی

پروفیسر محمود ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل انسان تھے۔ نرم خو، نرم طبیعت، اپنا مؤقف نہایت واضح انداز میں سمجھانے والے، بس ان کے اندر ایک سنک تھی اور بہت زیادہ قابل اور تعلیم یافتہ لوگوں میں اس طرح کی کوئی نہ کوئی سنک پیدا ہو جاتی ہے یا پھر صرف انہیں ان کے ساتھی پروفیسر اور لیکچرار ہی سنکی کہتے اور سمجھتے تھے، ورنہ اصولی طور پر وہ اپنی جگہ بالکل درست تھے، اصل میں وہ گرامر کی غلطی برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور ان کا زیادہ تر موضوع گرامر ہی ہوا کرتی تھی، ایک بے داغ اور پرسکون گھریلو زندگی گزار رہے تھے، حالانکہ ان کے ساتھی اس بارے میں بھی ذرا الگ خیالات رکھتے تھے۔

پروفیسر کی عمر تقریباً پچاس کے لگ بھگ ہوگی، جبکہ ان کی بیگم نازیہ نے پچھلے ہی دنوں اپنی بائیسویں سالگرہ منائی تھی۔ عمر کا یہ فرق ان دونوں کے درمیان کسی بھی حیثیت کا حامل ہو، لیکن لوگ اسے اکثر موضوع بنا لیا کرتے تھے، پھر پروفیسر کے گھر ایک چھوٹی سی پارٹی میں اعجاز نے پروفیسر کی بیگم نازیہ کو دیکھا اور اس کے ذہن میں فاسد خیالات پیدا ہو گئے، کئی دن تک وہ اس بارے میں سوچتا رہا اور اس کے بعد اس

نے اپنے ساتھی پروفیسر قاسم سے اس موضوع پر بات کی۔

''یار پروفیسر محمود ہر طرح سے میرے لیے قابل احترام ہیں، لیکن ایک مسئلے میں پروفیسر صاحب نے میرا خیال ہے ایک جرم کیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' قاسم نے اعجاز کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس دن دعوت میں پہلی بار میں نے ان کی مسز کو دیکھا، یار عمر کا اتنا بڑا فرق، نجانے اس کا پس منظر کیا ہے۔''

''ہاں اکثر اس موضوع پر ہم لوگ بات کرتے رہتے ہیں۔''

''ویسے بہت خوبصورت لڑکی ہے۔''

اتفاق سے کچھ ہی عرصے کے بعد ایک خاص موضوع کی تیاریوں میں اعجاز کو پروفیسر محمود سے منسلک ہونا پڑا اور وہ روزانہ شام کو پروفیسر کے پاس جانے لگا گھر کے ڈرائنگ روم میں وہ آدھی آدھی رات تک کام کرتے رہتے تھے، اس دوران نازیہ ہر طرح سے اعجاز کی خاطر مدارت کرتی رہتی تھی کیونکہ بہرحال وہ کچھ وقت کے لیے پروفیسر محمود کا مہمان تھا، لیکن پھر ایک دن جب موقع پاتے ہی اعجاز نے خوشبو میں بسا ہوا ایک رنگین لفافہ نازیہ کو دیا تو نازیہ حیران رہ گئی۔ آج وہ کام ختم ہو گیا تھا جس کے لیے اعجاز پروفیسر محمود کے گھر روزانہ آتا تھا، نازیہ نے لفافہ کھول کر خط نکالا، اس لفافے میں جو تحریر خط میں لکھی ہوئی ملی اس کا لب لباب یوں تھا۔

''میں نہیں جانتا محترمہ نازیہ کہ وہ کونسے عوامل تھے جن کی بناء پر آپ کو اس نو عمری میں قابل احترام پروفیسر محمود کے ساتھ شادی کرنا پڑا، دراصل ہمارے معاشرے میں بعض اوقات کبھی والدین کی جانب سے اور کبھی حالات کی الجھنوں سے ایسے عوامل پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان کی ساری زندگی غم و اندوہ کا مرکز بن جائے، مجھے کتنی ہی بار آپ کا چہرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، آپ یقین کیجئے میرا دل کہتا ہے کہ اس خوشیوں

سے بھری ہوئی عمر میں آپ کا چہرہ اس قدر سنجیدہ رہتا ہے' انسان کی خواہشیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ میری دلی آرزو ہے کہ کاش کسی طرح آپ کے چہرے کو وہ خوشیاں بخش دوں جو آپ کا حق اور آپ کی عمر کا حصہ ہے' کاش کسی طرح مجھے ایسی قدرت حاصل ہو جائے۔

خیر اندیش

پروفیسر اعجاز

نازیہ نے آنکھیں پٹپٹا کر اس خط کو دوبارہ پڑھا' دوسری بار پڑھ کر وہ آہستہ سے مسکرائی' پھر اس نے اسے تیسری بار پڑھا اور بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

دوسرے دن پروفیسروں کی نشست گاہ میں پروفیسر محمود نے اپنی جیب سے وہ رنگین اور خوشبو دار لفافہ نکالا اور پروفیسر اعجاز کی طرف دیکھنے لگے۔ پروفیسر اعجاز کی نگاہ جیسے ہی اس لفافے پر پڑی اس کی جان نکل گئی اس نے خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا' پروفیسر محمود کا چہرہ تو ہمیشہ ہی سنجیدہ رہا کرتا تھا' لیکن پروفیسر اعجاز کو یوں لگا جیسے آج اس چہرے پر صرف سنجیدگی نہ ہو تب پروفیسر محمود کی آواز ابھری۔

''پروفیسر اعجاز! براہ کرم زحمت کیجئے۔''

پروفیسر اعجاز کے پیروں کی جیسے جان نکل گئی تھی' بمشکل تمام وہ اپنی جگہ سے اٹھے' دوسرے پروفیسروں کو پروفیسر اعجاز کی اس کیفیت پر حیرت ہوئی تھی۔

''براہ کرم زحمت کیجئے۔ پروفیسر محمود نے پھر کہا اور لفافے سے وہ کاغذ نکال لیا' جس پر پروفیسر اعجاز کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر تھی۔

''یہ آپ ہی نے لکھا ہے۔'' پروفیسر محمود کی آواز ابھری۔ لیکن پروفیسر اعجاز کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی تھی' پروفیسر محمود نے وہ کاغذ کھول کر پروفیسر اعجاز کے سامنے کر دیا۔

''اس میں آپ نے جگہ جگہ گرامر کی غلطیاں کی ہیں' میں نے ان پر سرخ نشانات لگا دیئے ہیں براہ کرم دیکھ لیجئے گا' گرامر کی غلطی قابل برداشت نہیں ہوتی اور وہ بھی ایک پروفیسر سے۔''

پروفیسر اعجاز پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ بعد میں وہ خط خود بخود دوسروں کی نگاہوں کا مرکز بن گیا اور پھر ہر طرف قہقہے ابلنے لگے۔ بزرگ پروفیسر متین نے کسی قدر ترش اور نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

پروفیسر اعجاز کو شاید یہ بات معلوم نہیں ہے کہ پروفیسر محمود کی اہلیہ ایک متمول خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور انہوں نے پروفیسر کی بے پناہ قابلیت سے متاثر ہو کر خود یہ شادی کی ہے۔

ختم شد

اے بسا آرزو!

کوئی ایسی اچھوتی تصویر' کوئی ایسا انوکھا خیال جو دلوں کو لوٹ کر لے جائے' شامل سے آرٹ امپوریم نے فرمائش کی تھی کہ وہ آرٹ امپوریم کی سالانہ نمائش کے لیے کوئی تصویر بنائے' آرٹ امپوریم ہر سال ملک بھر کے مصوروں کی تصاویر کی نمائش کرتا تھا اور انعامات تقسیم کیا کرتا تھا۔ پھر یہ تصاویر فروخت کی جاتی تھیں اور یہ ایک باقاعدہ سلسلہ تھا۔ شامل کو تین بار آرٹ امپوریم سے پہلا انعام مل چکا تھا' آرٹ امپوریم کے مالک رحمان صاحب نے اس بار بھی شامل سے فرمائش کی تھی اور کہا تھا۔

''کوئی ایسی کلیجہ کھینچنے والی چیز نکالو جو بس تہلکہ مچا دے۔''

اور شامل اس تہلکے کی تلاش میں مستقل سڑک گردی کر رہا تھا کہ وہ اسے نظر آ گئی' عمر تقریباً سترہ سال ہو گی چہرے اور بدن کی دلکشی بتاتی تھی کہ کچھ ہی وقت پہلے وہ ایک تروتازہ پھول کی مانند ہو گی' بھیک مانگ رہی تھی' شامل کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

''دے دو بابو جی اللہ کے نام پر' اللہ زندگی سلامت رکھے۔'' شامل نے اس کے بجھے ہوئے وجود کو دیکھا۔ سوکھے ہوئے خشک ہونٹ انوکھی دلکشی کے حامل تھے'

آنکھوں میں جیسے کرب کا ایک جہان سمٹا ہوا تھا۔

''کیا نام ہے تیرا؟''

''نوراں ہے جی...... دے دو اللہ کے نام پر۔''

''نوراں! تو بیمار ہے۔''

''ہاں جی' سل کی بیماری ہو گئی ہے' پہلے ٹھیک تھی' ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں سو روپے روز کا خرچہ ہے' تین مہینے علاج کرانا ہو گا۔ بس جی ہم غریب لوگ اتنے پیسے کہاں سے خرچ کر سکتے ہیں' دے دے بابو جی اللہ کے نام پر۔''

''اور اگر میں تجھ سے یہ کہوں کہ میں تجھے دو سو روپے روز دوں گا؟'' شامل نے کہا۔

''مخول مت کرو جی' دے دو اللہ کے نام پر' اور ایک بات ہم تم سے کہیں بابو جی' ہم بھیک مانگتے ہیں' دھندہ نہیں کرتے۔''

''توبہ توبہ کیسی باتیں کر رہی ہے تو' دیکھ نوراں میں تجھے دو سو روپے روز دوں گا' تو بالکل بے فکر رہنا تیری عزت آبرو محفوظ ہے جس طرح چاہے یقین کر لے۔''

''سچ مچ بابو جی دو سو روپے روز دو گے مجھے؟''

''ہاں......''

''مگر مجھے کرنا کیا ہو گا؟''

''بس...... میں تیری تصویر بناؤں گا' تجھے تھوڑی دیر تک میرے سامنے بیٹھے رہنا ہو گا۔''

''لو یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی...... کہاں آنا ہو گا مجھے؟''

اور نوراں شامل کے پاس آنے لگی۔ شامل کو یقین ہو گیا تھا کہ ایک بیمار جوانی کی یہ تصویر اس کی زندگی کا حسین شاہکار ہو گی۔ پہلے دن نوراں دو سو روپے لے کر گئی

تو اس کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ دوسرے تیسرے اور چوتھے دن وہ اسی طرح آئی اور شامل اسے کینوس پر اتارتا رہا۔ پانچویں دن اس نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں میں تھوڑے ہی دنوں میں ٹھیک ہو جاؤں گی' ویسے ایک بات بتاؤں بابو جی رات کو مجھے کھانسی میں خون نہیں آیا۔''

''علاج شروع کر دیا تو نے۔'' شامل نے اس کے چہرے کی بکھری لٹوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بابو جی کیوں نہیں وہ تو میں نے پہلے ہی دن شروع کر دیا تھا' بس تین مہینے میں ٹھیک ہو جاؤں گی میں۔''

سولھویں دن جب وہ شامل کے گھر پہنچی تو شامل اس کا انتظار کر رہا تھا' بیس منٹ لیٹ ہو گئی تھی۔ اندر داخل ہو گئی تو شامل اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ کپڑے بھی صاف پہنے ہوئے تھے' چہرے پر شاید لیپا پوتی کی گئی تھی۔ ہونٹوں کی لپ اسٹک تو صاف نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں میں کاجل بھی لگا ہوا تھا۔

''کیا کیا۔'' شامل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں' نوراں نے شرما کر دانتوں میں انگلی دبا لی۔

''میں کہتا ہوں یہ کیا کیا ہے تو نے؟''

''بری لگ رہی ہوں بابو جی۔''

''بری کی بچی تیرا دماغ صحیح نہیں ہے کیا' کیا شکل بنا لی ہے' چل منہ ہاتھ دھو' مگر منہ ہاتھ دھونے سے بھی تو کام نہیں بنے گا' جا بابا جا۔ جیسے آتی ہے ویسے ہی آ' چل دفع ہو جا یہاں سے۔'' شامل نے غرا کر کہا اور اس کی آنکھوں کے چراغ بجھ گئے۔ ہونٹوں کی مسکان مدہم پڑ گئی' اس نے عجیب سی نگاہوں سے شامل کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

''کیسے ہو بابو...... پہلی بار تو ہم نے تمہارے لیے اپنے آپ کو تیار کیا ہے اور تم برا بھلا کہہ رہے ہو۔'' وہ چلی گئی۔ دوسرے دن آئی تو وہی بجھے چراغ شامل کی نگاہوں کے سامنے تھے۔

ایک مہینہ دس دن میں تصویر مکمل ہو گئی' لیکن شامل اس کے ساتھ ناانصافی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسے تین مہینوں کا معاوضہ پیشگی ادا کر دیا۔

''بس...... کل سے آنے کی ضرورت نہیں ہے میرا کام مکمل ہو گیا۔''

''کل سے نہیں آئیں گے ہم بابو جی۔'' اس کے لہجے میں جیسے سارے جہان کا دکھ سمٹ آیا تھا۔

''ہاں اب ضرورت نہیں ہے۔'' وہ شامل کو دیکھتی رہی' شامل نے اس کے رخساروں پر دو آنسو لڑھکتے ہوئے دیکھے تھے اور اس کے بعد وہ منہ پھیر کر چلی گئی۔

شامل کو معمول کے مطابق آرٹ امپوریم کا پہلا انعام ملا تھا اور وہ خوشیوں سے پھولا نہیں سما رہا تھا' لوگ بھکارن کی تصویر کی تعریف کر رہے تھے' لیکن آرٹ امپوریم کے عین سامنے ایک نوجوان بھکارن کی لاش پڑی ہوئی تھی' اس کے پاس ہی خون کا ڈھیر تھا جو اس کے منہ سے بہا تھا۔

''بیچاری ٹی بی کی مریض معلوم ہوتی تھی' بھئی اس کی لاش کو یہاں سے اٹھوانے کا بندوبست کرو۔'' کسی ہمدرد نے کہا۔

ختم شد

آواز

ماہی گیروں کی بستی تھی۔ شہری آبادیوں سے دور ایک ساحل پر ان لوگوں نے اپنی جھونپڑیاں بنا رکھی تھیں۔ سمندر سے رزق حاصل کر کے منڈیوں میں مچھلیاں فروخت کرتے اور گزارہ کرتے لیکن ان دنوں مچھلیوں کا کال پڑ گیا تھا' ایسا لگتا تھا جیسے مچھلیوں نے اس علاقے میں آنا ہی چھوڑ دیا ہو۔ دور دور تک کشتیاں نکل جاتی تھیں' لیکن مچھلی ہاتھ نہیں لگتی تھی۔ جادوٹونے سب کچھ ہو رہا تھا' منتر پڑھے جاتے تھے' مندروں میں ماش کی دال اور آٹا ملا کر ڈالا جاتا تھا مگر مچھلیوں کا کہیں نشان نہیں ملتا تھا' تب سردار بھوما نے کہا۔

''بھائیو! جہاں رزق ہوتا ہے وہیں زندگی ہوتی ہے' ہم یہ ساحل چھوڑ دیں گے' مجھے ایک ایسی جگہ معلوم ہے جہاں ہم اپنی بستی آباد کر سکتے ہیں۔ تیاریاں ہونے لگیں' لیکن اس دن رکھا نے جب سمندر میں جال ڈالا تو جال میں وزن محسوس ہوا' رکھا اور اس کے تینوں بھائیوں نے جال کو کھینچا' لیکن جال جب اوپر پہنچا تو اس میں ایک انسانی بدن پھنسا ہوا تھا۔

شور مچ گیا' شاید کوئی لاش ہے' ہوسکتا ہے کسی نے خودکشی کی ہو۔ ہوسکتا ہے کسی

جہاز سے گر پڑا ہو۔ لیکن وہ زندہ تھا۔ وہ ایک خوبصورت اور دلکش جوان تھا کہ دیکھنے والی آنکھ اس پر سے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ پوری بستی کا منظور نظر بن گیا' کھوئی ہوئی یاداشت کا مریض تھا کیونکہ اس سے جب بھی کسی چیز کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ کہتا کہ میں نہیں جانتا۔ ہاں ایک دن جب مائی رما کا بیٹا شدید بخار میں پھنک رہا تھا اور رما آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی تو وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔

''تو کیوں رو رہی ہے بہن؟''

''میرا بچہ بیمار ہے' اس کے لیے دوا لانی ہے' مگر میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

''دوا کیا چیز ہوتی ہے؟''

''ارے بابا۔ دوا وہ چیز ہوتی ہے جس سے یہ بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''وہ تو میرے پاس ہے۔''

''تیرے پاس۔''

''ہاں یہ دیکھ۔'' یہ کہہ کر اس پراسرار سمندری نوجوان نے اپنے سینے کے پاس کچھ ٹٹولا پھر ایک کھڑکی کھولی اور اس میں سے دوا کی شیشی نکال کر رما کو دے دی۔ رما نے اپنے بچے کو دوا پلائی اور بچہ ہٹا کٹا ہو گیا' لیکن چاروں طرف دھوم مچ گئی۔

''یہ تو دیوتا ہے کوئی۔''

''کوئی اوتار ہے۔''

''تقدیر کھل گئی ہماری۔''

''اب کیا کریں؟''

''روانگی کا انتظام تو ہو ہی چکا ہے' چلتے ہیں' لیکن یہ دیوتا' یہ ہمارے درمیان کہاں سے آ گیا۔'' اور دیوتا واقعی ہر شخص کی ضرورت پوری کر دیا کرتا تھا۔ کسی بھی حاجت مند سے وہ دلسوزی سے پوچھتا اور اس کی وہ حاجت اپنے سینے میں کھڑکی کھول

کر پوری کر دیا کرتا تھا۔ بستی دوسری جگہ بس گئی' لیکن اب ماہی گیر اپنے اس دیوتا کی پوجا کرنے لگے تھے اور اپنی تمام ضرورتیں اس سے پوری کر لیا کرتے تھے' لیکن علاقے کے منتظم افسر اعلیٰ کی بیٹی سومایہ نے اس نوجوان کو دیکھا تو اس سے دل ہار بیٹھی۔ باپ کی لاڈلی تھی۔

''پاپا میں اس سے شادی کروں گی۔''

''بیٹی...... یہ ایک جاہل مچھیرا ہے۔''

''کچھ بھی ہے پاپا۔'' اور باپ جس نے ہمیشہ بیٹی کے لیے خوشیاں خریدی تھیں اسے رخصت کر کے اپنے گھر لے آیا۔ وہ خود بھی سومایہ سے محبت کرنے لگا تھا۔ سومایہ اس کی بیوی بن گئی تھی۔ لیکن جب مالی کے اندھے بچے نے پتھر کے ٹکڑوں سے کھیلتے ہوئے اسے بتایا کہ پتھر کے ٹکڑے اس کے کھلونے ہیں اور غریبوں کے کھلونے یہی ہوا کرتے ہیں تو اس نے اپنے سینے کی کھڑکی کھول کر مالی کے بچے کے سامنے کھلونوں کے انبار لگا دیئے۔ لیکن یہ منظر سومایہ نے دیکھ لیا اور حیرت سے بولی۔

''یہ کیا ہے' یہ تم اپنے لباس سے کھلونے نکال نکال کر بچے کو کہاں سے دے رہے تھے؟''

''میرے سینے میں ایک کھڑکی ہے' ایک دروازہ ہے' جب کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کی یہ ضرورت پوری کر دوں' بس یہ کھڑکی کھل جاتی ہے' تو میں اشیاء کے انبار لگا دیتا ہوں۔''

''تم نے مجھے اس کے بارے میں پہلے کیوں نہیں بتایا یہ ہے کیا چیز آخر؟''

''یقین کرو میں نہیں جانتا۔ بس یہ میرے دل کی آواز ہوتی ہے' میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کا دکھ اپنے سینے میں سمیٹ لوں اور میرے سینے میں کھڑکی کھل جاتی ہے۔''

''لیکن ایک بات سنو' آئندہ تم میری اجازت کے بغیر یہ کھڑکی کبھی نہیں کھولو گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے معصومیت سے کہا۔

اور پھر جب بھی کوئی حاجت منداس کے پاس پہنچتا اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے کی جانب اٹھتا' لیکن اسے سومایہ کی نصیحت یاد آ جاتی' اور اس رات جب اچانک سومایہ کے گردے میں درد اٹھا اور وہ کرب سے تڑپنے لگی تو اس نے اسے جگا کر کہا۔

''میں...... میں مر رہی ہوں...... دیکھو میں مر رہی ہوں۔ مجھے دوا دو۔''

''ہاں دوا...... وہ تو میرے پاس ہے۔'' یہ کہہ کر اس کا ہاتھ اپنے سینے کی جانب گیا لیکن اس کے بعد وہ اپنے پورے سینے کو ٹٹولتا رہا' اب وہاں کوئی کھڑکی نہیں تھی' ہو بھی نہیں سکتی تھی' انسانی جسم میں بھلا کھڑکیاں کہاں ہوتی ہیں' یہ تو جذبے ہوتے ہیں' کسی کو دینے کی تڑپ' مالک کائنات نے تمہیں ہر چیز سے مالا مال کر دیا ہے' سب کچھ دیا ہے تمہیں اس نے۔ اس لیے اس کے بندوں کی ضرورتیں پوری کرو' حاجت مندوں کی خواہشوں کی تکمیل کرو' تمہارے سارے وجود میں کھڑکیاں ہی کھڑکیاں ہیں' لیکن جب تم اپنا ہاتھ حاجت مندوں کو دینے سے کھینچ لیتے ہو تو تمہارے وجود کی ساری کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں۔

ختم شد

انعام

میرا نام روحیل ہے، گھر والوں میں میری بیوی سارہ ہے، دو بچے ہیں، ماں باپ ہیں، ذریعہ معاش ایک چھوٹا موٹا کاروبار ہے اور زندگی بڑی اچھی گزر رہی ہے۔ کچھ سال پہلے ہمارے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جسے میں آج بھی یاد کرتا ہوں تو ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے، واقعہ کچھ یوں ہے۔

ہمارے گھر میں ایک پرانا ملازم فضلو بابا تھا۔ پچاس سال کی عمر کا نیک سیرت صوم وصلوٰۃ کا پابند یہ شخص نہایت ایماندار اور محنتی شخص تھا۔ ہم سب اس پر بے پناہ اعتماد کرتے تھے۔ گھر میں اسے دوسرے ملازموں سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ایک دن جب میں آفس سے واپس آیا تو میری بیوی سارہ نے مجھ سے کہا۔

”سنیں! میری وہ سونے کی چین نہیں مل رہی جو آپ نے میری سالگرہ پر بنوا کر دی تھی۔“

”نہیں مل رہی، اچھی طرح اپنی چیزیں دیکھو، گھر میں ڈھونڈو، کہاں جائے گی، یہیں کہیں ہوگی۔“

”کہیں بھی نہیں ہے۔“

”ارے..... پھر کہاں جاسکتی ہے، کب سے غائب ہے؟“

”کل رات کو سوتے وقت اتار کر تکیے کے نیچے رکھی تھی، اکثر رات کو سوتے وقت چین اتار کر تکیے کے نیچے رکھ دیتی ہوں اور پھر صبح پہن لیتی ہوں، آج صبح میں ذرا جلدی اٹھ گئی تھی اور چین پہننا بھول گئی تھی، دوپہر کو جب میں آرام کرنے کے لیے لیٹی تو مجھے چین کا خیال آیا اور میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا، لیکن چین وہاں نہیں تھی پھر تو میرا سارا آرام غارت ہوگیا، میں نے اسی وقت امی جان کو بتایا اور ان کے ساتھ مل کر ہر ممکن جگہ دیکھ ڈالی۔

”تمہیں اچھی طرح یاد ہے نا کہ تم نے چین تکیے کے نیچے رکھی تھی۔“

”ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چین تکیے کے نیچے ہی تھی۔“

”چلو..... اب ہو بھی کیا سکتا ہے، ایک چین ہی کی تو بات ہے، پولیس میں تو رپورٹ کرانے سے رہے، چنانچہ صبر کرو، اگلے مہینے نئے ڈیزائن کی چین بنوا دوں گا۔“ میں نے کہا اور پھر اس کے بعد بات آئی گئی ہوگئی۔

رات کے کھانے پر امی نے چین کی گمشدگی کا ذکر چھیڑ دیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا سونے کا کھونا برا شگون ہے، ابو نے بھی اس بات کی تائید کی اور کہا کہ چین ملنا ضروری ہے ورنہ گھر پر مزید آفت آسکتی ہے۔ چنانچہ ابو نے کھانے کے بعد سب ملازمین کو جمع کیا اور کہا۔

”بھئی ہماری بہو کی سونے کی چین گم ہوگئی ہے اور گھر سے ہی گم ہوئی ہے۔ میرے ایک دوست نظامی صاحب ہیں، بڑے اللہ والے آدمی ہیں، میں ان کو آپ سب کا نام دے دوں گا، وہ کچھ وظیفہ وغیرہ پڑھیں گے اور چور کا نام بتا دیں گے اور پھر چور کے ساتھ بہت برا سلوک ہوگا۔ میاں تیار رہنا کل ہمیں نظامی صاحب کے پاس چلنا ہے۔“ ابو نے میری طرف رُخ کر کے کہا۔

"جی ابو"۔ میں نے کہا' اس کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔

مجھے آج کے کاروباری معاملات کا حساب کتاب کرنا تھا چنانچہ دیر تک کام کرتا رہا' کام سے فراغت ہوئی تو ذہن پھر اسی طرف چلا گیا' چین کہاں غائب ہوسکتی ہے' گھر کے نوکر بیچارے سب ہی اچھے تھے۔ ویسے بھی بیڈ روم وغیرہ میں آنے کی اجازت صرف فضلو بابا کو تھی۔ لیکن فضلو بابا۔ ارے نہیں نہیں...... وہ بھلا چین کیسے چرا سکتے ہیں۔ میں نے سرے سے فضلو بابا کا خیال ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

دوسرے دن ابو صبح ہی صبح تیار ہو گئے' ناشتے کے بعد میں اور ابو باہر نکل کر گاڑی کی طرف بڑھے ہی تھے کہ اچانک فضلو بابا دوڑتے ہوئے ہمارے پیچھے آئے اور کہنے لگے۔

"صاحب رکیں۔رکیں...... وہ وہ......وہ اس طرف دیکھیں ...... وہ دیکھیں...... وہ گملے کے پاس کوئی چیز چمک رہی ہے ...... میرا خیال ہے کہ وہ ...... وہ ......" فضلو بابا کے اس طرح شور مچانے پر میں اور ابو اسی جگہ رک گئے اور مڑ کر اس طرف دیکھنے لگے جہاں فضلو بابا نے اشارہ کیا تھا۔ گملوں کے درمیان کی گھاس اپنی جگہ سے تھوڑی سی ہٹی ہوئی تھی اور اس میں سے سونے کی چین جھانک رہی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ابو نے فضلو بابا سے کہا۔

"فضلو! کہیں وہ سارہ کی چین تو نہیں ہے' ذرا قریب جا کر اس جگہ کو چیک کرو۔" اور فضلو بابا تیزی سے اس جانب بڑھ گئے' اس جگہ کے قریب جا کر زمین پر بیٹھ کر انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اس جگہ کو کھودا اور تھوڑی ہی دیر میں اس جگہ سے چین برآمد کر لی۔

ابو آگے بڑھ کر فضلو بابا کے پاس پہنچ گئے اور چین اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ابو

نے چین کا اچھی طرح جائزہ لیا پھر سارہ کو بلایا گیا' سارہ نے بھی چین پہچان لی تھی۔ ابو فضلو کو شاباش دینے لگے' انہوں نے اسی وقت فضلو کو پانچ سو روپے انعام بھی دیا' اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"بیٹا روحیل۔"

"جی ابو۔"

"اس کارنامے کے نتیجے میں فضلو بابا کی ترقی ہوگئی ہے' اب تم فضلو بابا کو فیکٹری لے چلو اور وہاں کوئی مناسب کام ان کے سپرد کر دو' اور آج سے ان کی رہائش کا بندوبست بھی فیکٹری کوارٹرز میں کر دو' بیچارے روز روز آنے جانے کی تکلیف کہاں کریں گے۔" اب فضلو بابا کی حالت قابل دید تھی' وہ مرے مرے لہجے میں بولے۔

"نن...... نہیں صاحب میں یہیں ٹھیک ہوں۔ مجھے یہیں کسی کونے میں پڑا رہنے دیں۔"

"فضلو بابا! ہمارا حکم نہیں مانیں گے آپ' چلیں ہمارے ساتھ۔ چلو بیٹا پہلے فیکٹری چلتے ہیں' فضلو بابا کو ڈراپ کر کے پھر آگے چلیں گے۔"

"جی ابو۔" میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی' فضلو بابا اپنا سامان لے کر ہمارے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھے تھے۔ سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا تھا' ظاہر ہے سونے کی چین فضلو بابا نے ہی چرائی تھی اور اپنے پاس اس خیال سے محفوظ کر لی تھی کہ مناسب موقع ملنے پر بیچ دیں گے' لیکن بس موقع تو نہیں ملا' البتہ چین برآمد کرنے کے انعام میں پانچ سو روپے کے ساتھ گھر بدری کی سزا ضرور مل گئی تھی۔

ختم شد

جنون

شاہو مجھ سے زیادہ متجسس تھا' میرا نوجوان ملازم جو جمال گڑھی سے میرے ساتھ یہاں رانی پور تک آیا تھا۔ رانی پور میں مجھے ایک کھاد بنانے والے فیکٹری میں پرچیز آفیسر کی جگہ ملی تھی۔ یہ ملازمت میرے ایک دوست نے مجھے دلوائی تھی۔ بہترین ملازمت تھی۔ شاندار تنخواہ۔ طے یہ کیا تھا کہ چار چھ مہینے یہاں رہ کر یہاں کے حالات کا تجزیہ کروں گا اور اس کے بعد بیوی بچوں کو یہاں بلوا لوں گا۔ شاہو میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد ہمیں یہ گھر ملا تھا جو عام آبادی سے ذرا ہٹ کر ایک پرفضا مقام پر تھا۔

اونچے نیچے پہاڑی ٹیلوں کے درمیان یہ گھر جس نے بھی بنوایا تھا وہ بڑا خوش ذوق آدمی تھا۔ برابر میں ایک نرسری تھی' اس نرسری کے مالک کے بارے میں معلوم ہوا کہ ایک ریٹائرڈ میجر ہے جس نے یہ نرسری کھولی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ نرسری بے حد خوبصورت تھی' اکثر لوگ یہاں آتے جاتے تھے اور اچھی خاصی پودوں کی خرید وفروخت ہوا کرتی تھی۔ میجر بیاس کو بھی میں نے دیکھا تھا' ایک بھوت قسم کا آدمی تھا جو ایک ٹانگ سے معذور ہو چکا تھا اور بیساکھی کے سہارے چلتا تھا۔

شاہو نے کہا تھا۔

''صاحب بالکل ہی جنگلی کبوتر لگتا ہے۔'' یہ بات وہ خود نہیں بتا سکا تھا کہ میجر بیاس اسے جنگلی کبوتر کیوں لگتا ہے۔ پھر ہم نے پہلی بار رات کی تاریکیوں میں ایک انسانی چیخ سنی اور بدحواس ہو گئے' چیخ نرسری کی طرف سے ہی آئی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے کوئی مدد مدد چیخ رہا ہو۔ لیکن بہرحال کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ لیکن تقریباً نو یا دس دن کے بعد پھر ویسی ہی چیخ اور مزید اتنے ہی دن کے بعد جب تیسری چیخ سنائی دی تو ہمارا تجسس آسمان کو پہنچ گیا اور ہم نے طے کیا کہ معلومات حاصل کریں گے۔ یہ اندازہ تو ہو چکا تھا کہ چیخوں کی آوازیں نرسری سے ہی آتی ہیں اور ہر بار یہ آوازیں نئی ہوتی ہیں۔ نرسری وَیسے ہی آسیب زدہ معلوم ہوتی تھی خاص طور سے رات کی تاریکیوں میں تو وہاں جو درخت اور جھاڑیاں وغیرہ نظر آتی تھیں' لگتا تھا کہ کوئی جنگل بیابان ہے۔

بہرحال اس دن اکتوبر کی پہلی تاریخ تھی اور چاند بھی پورا تھا' میں شاہو کے ساتھ تیاریاں کر کے نرسری کی نیچی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو گیا۔ بے حد اندھیرا تھا اور خوب سردی بھی تھی۔ چلتے چلتے ہم ایک ایسی اونچی سی جھاڑی کے قریب پہنچے جو ہمیں چھپا سکتی تھی' رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی' ہم لوگ پراسرار نرسری میں آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگے کہ دفعتہً ہی ہمیں کچھ سراسراہٹیں سی محسوس ہوئیں' میں نے اور شاہو نے دیکھا کہ وہ میجر بیاس تھا' جو کسی ٹرالی نما چیز کو دھکیل رہا تھا اور اپنی بیساکھی کی کھٹ کھٹ کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔

''یہ کیا قصہ ہے۔''

''پتہ نہیں صاحب۔''

''ذرا احتیاط' آؤ آگے چلیں۔''

ہم آگے بڑھے تو تھوڑے فاصلے پر خاردار تاروں کی ایک رکاوٹ آ گئی۔

''چلیں صاحب دیکھیں۔'' شاہو نے کہا اور خود جلدی سے خاردار تاروں پر پیر رکھ کر دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ کچھ لمحوں کے بعد میں بھی کوشش کر کے دوسری جانب پہنچ گیا۔ تھوڑے فاصلے پر بجلی کی مدھم روشنی نظر آ رہی تھی' میری پرتجسس نگاہیں اس طرف چلی گئیں۔ اچانک ہی ہمارے کانوں میں ایک بھیانک چیخ ٹکرائی۔ کوئی بڑی زور سے چیخا تھا۔

''بچاؤ بچاؤ خدا کے لیے بچاؤ۔'' اس سے پہلے میں کچھ سوچتا شاہو بڑی تیزی سے لپکا اور ایک سیکنڈ کے بعد ہی وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا' میں تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ دفعتہً پھر چیخوں کی آواز سنائی دی۔

''بچاؤ خدا کے لیے بچاؤ'' اور اس بار میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس آواز کو سنا' یہ شاہو کی آواز تھی۔ ایک طرف گھنی جھاڑیوں کے اندر بری طرح اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ خوف نے مجھے محتاط کر دیا۔ میں نے رک کر جھاڑیوں پر نگاہ ڈالی اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سامنے ایک انتہائی خوفناک منظر تھا۔ ایک لمبے سے اژدھے کے کھلے ہوئے منہ میں شاہو آدھے دھڑ تک پھنسا ہوا تھا اژدھے کا جسم اس کے بدن سے لپٹتا جا رہا تھا۔ اور پھر میں نے شاہو کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آوازیں سنیں۔ میں خوف سے چیختا ہوا پیچھے ہٹا سامنے ہی لوہے کا ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ لوہے کے دروازے کی دوسری طرف مجھے میجر بیاس نظر آیا' میں نے چیخ کر اس سے کہا۔

''مسٹر بیاس' مسٹر بیاس۔ پلیز ادھر دیکھیے۔ اس طرف میں نے ایک اژدھا دیکھا ہے۔''

بیاس نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''کہاں کس طرف؟''

''آپ پلیز آئیے دیکھیے اس طرف ...... میں نے رخ بدل کر کہا۔ اور اسی

وقت بیاس کی بیساکھی میرے سر پر پڑی اور میں چکرا کر رہ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن نہ سنبھال سکا' میں نے دیکھا کہ میجر بیاس اپنے مضبوط اور طاقتور ہاتھ سے میرے کالر کو پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ایک طرف لے جا رہا ہے۔ اور پھر ایک جگہ اس نے مجھے زمین پر ڈال دیا اور بولا۔

''ہاں...... تو تم ان چیخوں کا سراغ لگانے کے لیے اندر آئے ہو۔ بتاتا ہوں میں تمہیں بتاتا ہوں' دیکھو ...... یہ کیکٹس ہے' اور کیکٹس کے یہ درخت جگہ جگہ میری اس نرسری میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ذرا دیکھو اس پھول کو دیکھو تم نے اتنا حسین پھول اس سے پہلے کبھی دیکھا ہے' یہ کیکٹس کا پھول ہے۔''

میں نے اس پھول کو دیکھا اس کا رنگ سرخ اور زرد تھا۔ وہ کہنے لگا۔

''یہ پودا دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے اور شاید افریقہ کے پراسرار جنگلوں میں کسی گمنام حصے کے بعد یہ صرف میری اس نرسری میں ہے' میں نے اسے دوسری جنگ عظیم کے دوران رنگون کے محاذ پر ایک پہاڑی سے برآمد کیا تھا' لیکن اسے زندہ رکھنے کے لیے انسانی خون کی ضرورت ہوتی ہے' اور میں اب تک اسے نجانے کتنے انسانوں کا خون پلا چکا ہوں' اس کی جڑیں اندر سے یوں کھوکھلی ہوتی ہیں جیسے کسی اژدھے کا منہ' تھوڑے ہی دن کی بات ہے کہ یہ جڑیں اس نرسری سے باہر نکل جائیں گی۔ اس درخت کی غذا خون ہے۔ اس میں پہلی بار یہ پھول آیا تھا اتنا حسین پھول کہ بیان سے باہر ہے' بس اس وقت سے میں اسے جسم پیش کرتا ہوں تاکہ یہ پھلتا پھولتا رہے' انسانی خون اس کی مرغوب غذا ہے' دو گھنٹے گزرنے کے بعد یہ پھول مرجھا جاتا ہے اور پھر یہ درخت ایک عام درخت رہ جاتا ہے۔''

اچانک ہی میجر نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔

''تم ابھی دیکھنا ابھی بس چند لمحوں کے بعد۔''

اور واقعی میں نے دیکھا کہ دوسرے لمحے تھوڑے فاصلے پر ایک لمبی سی شے نے سر ابھارا' دیکھتے ہی دیکھتے اس میں حرکت ہوئی۔ درخت کی ٹیوب نما موٹی سی مدفون جڑ اب کسی کوبرے کی مانند پھن نکالے سامنے کھڑی تھی۔ خوف سے میرا سارا وجود تھرتھر کانپنے لگا۔ زمین کی گہرائیوں سے دوسری جڑیں بھی ابھر رہی تھیں۔ بالکل سانپوں کی طرح جو بلوں سے باہر نکل رہے ہوں۔ میرا بدن پسینے سے تر تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ابھی چند لمحوں کے بعد میرے پیروں کے نیچے سے بھی کوئی جڑ نمودار ہو گی اور میری ٹانگ بھی پکڑ لے گی' میں نے شاہو کو تو موت کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میجر بیاس قہقہے لگا رہا تھا اور پھر اس نے کہا۔

''دیکھو ذرا اس طرف دیکھو ...... آہا ...... کیا خوبصورت جڑ ہے؟ لیکن پھر دوسرے لمحے ایک بھیانک چیخ سے فضا تھرا اٹھی۔ یہ چیخ خود بیاس کے منہ سے برآمد ہوئی تھی جو مارے خوشی کے اپنی حفاظت سے غافل ہو چکا تھا۔ ایک پودے نے اس کی ٹانگ کو جکڑ لیا' بیاس نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر بے سود' لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے وہاں سے چھلانگ لگا دی تھی۔

پھر ظاہر ہے مجھے پولیس کو اس بارے میں اطلاع دینی پڑی تھی۔ شاہو میرا ملازم ہی نہیں میرا دوست بھی تھا۔ جو ایک بے بسی کی موت کا شکار ہو گیا تھا' لیکن یہ منظر' یہ منظر آج بھی میرے دل و دماغ میں محفوظ ہے۔ وہ گھر تو میں نے خیر دوسری صبح ہی چھوڑ دیا تھا۔ میرا سامان بھی بڑی مشکل سے دوسرے لوگوں نے منتقل کیا تھا اس وقت جب پوری نرسری کو کھود کر پھینک دیا گیا تھا۔ پتہ نہیں میجر بیاس پاگل تھا' یا پھر بعض شوق جنون کی شکل اختیار کر جاتے ہیں' بہرحال اس کے جنون نے نجانے کتنے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

ختم شد

تجربہ

بے وقوف ہو تم لوگ' اس سائنسی دور میں بھلا ان توہمات کی کیا گنجائش ہے۔ ستارہ شناسی' پامسٹری' حاضرات قیافہ شناسی' ڈھکوسلے والی باتیں ہیں یہ ساری کی ساری جن کا حقیقتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے' بہت سے ایسے دوست تھے جو ان تمام چیزوں سے دلچسپی بھی رکھتے تھے اور اس پر یقین بھی رکھتے تھے۔ فیض نے ایک دن اس سے کہا۔

''افضال تم پراسرار علوم پر یقین نہیں رکھتے ہو نا؟''

''بالکل نہیں۔''

''آج تم ذرا میرے ساتھ چلو...... میں دعویٰ کرتا ہوں کہ تم ان علوم پر یقین کرنے لگو گے۔''

افضال ہنسنے لگا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔''

جس جگہ افضال اپنے دوست کے ساتھ گیا وہاں کا ماحول بہت پراسرار تھا۔ بڑے سے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اسے یوں لگا جیسے ایک عجیب سی تنہائی ہے یہاں۔ فرشی نشست تھی' کمرے میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ ایک طرف ایک

نیچی میز رکھی ہوئی تھی اور اس میز کے قریب کوئی خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ تاریکی کی وجہ سے ان کے نقوش نمایاں نہیں تھے۔ لیکن جب افضال کی نگاہیں اندھیرے کی عادی ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک عمر رسیدہ خاتون ہیں اور گہرے سبز رنگ کا لبادہ پہنے ہوئے ہیں۔

''بیٹے ذرا قریب آ جاؤ۔'' انہوں نے افضال سے کہا اور افضال میز کے قریب پہنچ گیا۔ میز پر کچھ سامان رکھا ہوا تھا لیکن وہ اس سامان کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔ اسی وقت ایک سرخ رنگ کا چھوٹا سا بلب روشن ہو گیا جس کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ میز پر ایک گول کاغذ بچھا ہوا ہے اور اس کے درمیان میں ایک بڑی سی سوئی لگی ہوئی ہے جیسے قطب نما میں ہوتی ہے۔ دائرے میں چاروں طرف حروف تہجی لکھے ہوئے تھے، سوئی نیچے کے ایک ایسے خانے پر رکی ہوئی تھی جس میں کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا اور اسے دیکھ کر افضال کو یوں لگا جیسے جوئے خانوں میں دائروں میں سوئی گھومتی ہے۔ بہرحال اس میز پر کچھ اسی قسم کا دائرہ بنا ہوا تھا۔ فرق یہ تھا کہ قسمت آزمائی کے دائروں میں کچھ نمبر لکھے ہوئے ہوتے ہیں اور اس دائرے میں حروف تہجی لکھے ہوئے تھے۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' خاتون نے پوچھا۔

''افضال۔''

''دیکھو افضال میں خود کچھ نہیں کرتی، میں تو بس روحوں سے مدد لیتی ہوں، انہیں بلا لیتی ہوں اور وہ روح جواب دیتی ہے۔'' افضال کے اندر کی کیفیت ابھر آئی اس نے کسی قدر تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''تو کیا ہمیں روح کی آواز سنائی دیتی ہے؟''

''نہیں، میں نے ایک خاص طریقہ کار اختیار کیا ہے اور اس سوئی اور دائرے پر

عمل پڑھا ہے، جب روح آتی ہے تو یہ سوئی زور سے حرکت کرتی ہے اور سائل اپنا سوال کر دیتا ہے تو......'' یہ کہتے کہتے وہ رک گئی، ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''مگر تم یہ سب کچھ کیوں پوچھتے ہو۔ ابھی جو کچھ ہوگا تمہارے سامنے ہی ہوگا، تم جو پوچھنا چاہتے ہو سوچ لو اور جب میں کہوں تو اپنا سوال دہرا دینا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ تم کس کی روح کو بلوانا چاہتے ہو؟'' افضال نے ایک لمحے تک سوچا، واقعی یہ ماحول اس پر مسلط ہوتا جا رہا تھا، کچھ لمحے کے بعد اس نے کہا۔

''میں اپنے والد کی روح کو بلوانا چاہتا ہوں۔''

کمرے میں سناٹا چھا گیا، اب کمرے میں تین افراد کے سانس لینے کی آوازوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ عورت افضال اور اس کا دوست، چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور روشنی صرف اس خانے پر مرکوز تھی جہاں ابھی کچھ لمحوں کے بعد روح آ کر سوئی کو حرکت دینے والی تھی۔ معمر خاتون نے کچھ پڑھنا شروع کر دیا اور افضال کو واقعی اپنے اوپر غنودگی سی طاری ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ درحقیقت ماحول سے متاثر ہوتا جا رہا تھا۔ خاتون کی آواز ابھری۔

''تم اپنے باپ کی روح کو آواز دو، اپنی خواہش کا اظہار کرو۔''

''میں اپنے والد کی روح کو بلانا چاہتا ہوں۔''

''اور......'' عورت کی پراسرار آواز ابھری۔

''میں اپنے والد کی روح کو بلانا چاہتا ہوں۔''

''کیا نام تھا تمہارے والد کا؟''

''ظفر علی۔'' افضال کے منہ سے یہ آواز نکلی ہی تھی کہ کمرے میں ایک دم روشنی

کا جھماکہ ہوا جیسے فوٹو گرافر کی فلیش گن کا ہوتا ہے اور پھر بلب کی روشنی سرخ سے اچانک سبز ہوگئی اور دائرے میں بنی ہوئی سوئی تیزی سے حرکت کرنے لگی' مگر یہ حرکت خالی خانے ہی میں محدود تھی۔ خاتون کی پراسرار آواز ابھری۔

''تمہارے والد کی روح کمرے میں موجود ہے۔'' نجانے کیوں یہ جملہ سنتے ہی افضال کا پورا بدن پسینہ چھوڑنے لگا اب اس کے کان کمرے میں قدموں کی آواز سن رہے تھے اور دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ اس آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ جب کبھی اس کے والد کسی بات سے بے چین ہوتے تھے تو وہ اسی طرح کمرے میں چہل قدمی کرتے تھے' یہ مانوس چاپ تھی۔ اچانک ہی معمر خاتون کی آواز آہستہ سے ابھری۔

''افضال اپنے والد کی روح کو زیادہ پریشان مت کرو' سوال کرو اور پھر جلد از جلد انہیں رخصت کر دو۔'' سوئی نے حرکت کی تو مختلف خانوں تک جاتی اور خالی خانے تک واپس آجاتی اور جب سارے حروف اس نے ملائے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے' افضال کے والد اسے اسی انداز میں مخاطب کرتے تھے۔ دفعتہً ہی افضال کے ذہن میں ایک تصور ابھرا' اگر یہ کوئی چالاکی نہیں ہے تو کیا میں اپنے باپ سے ایک سوال کروں۔ افضال نے کہا۔

''کیا آپ میری والدہ کا نام بتا سکتے ہیں؟'' اور جواب میں سوئی حروف تہجی پر گردش کرنے لگی۔ وہ کسی ایک حرف پر جا کر رکتی اور خالی خانے تک واپس آجاتی۔ یہاں تک کہ سوئی نے رشیدہ کا نام لکھ دیا۔ افضال اس تجربے سے نڈھال سا ہوگیا تھا۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

''آپ کا انتقال کس وجہ سے ہوا؟'' یہ وہ سوال تھا جو مدتوں سے افضال کے ذہن میں تھا۔ سوئی نے حرکت کی اور افضال سناٹے میں رہ گیا۔ اس بار سوئی کی حرکت نے لفظ زہر تخلیق کیا تھا۔ افضال کا سارا وجود لرزنے لگا۔ اس نے سوال کیا۔

''زہر کس نے دیا تھا؟'' سوئی کی گردش پھر شروع ہوگئی اور ایک نام ذہن میں ابھرا۔

''باقر علی۔'' افضال کے اعصاب جواب دینے لگے تھے اور پھر خاتون نے کہا۔

''بس اب روح کا واپس جانا ضروری ہے۔'' کچھ لمحوں کے بعد خالی سوئی خالی خانے پر جا کر رک گئی اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں روشنی ہوگئی' افضال نے خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر نکل آیا۔

''ہاں اب بتاؤ کیا کہتے ہو؟''

''مجھے یقین ہے کہ جو کچھ ہوا ہے بالکل ٹھیک ہوا ہے' میرے والد کو زہر دیا گیا تھا مگر اس وقت تو میں بہت چھوٹا تھا۔''

''تو پھر وہ کون ہے جس نے تمہارے والد کو زہر دیا؟''

''میں جانتا ہوں وہ کون ہے؟''

بہرحال بات ختم ہوگئی لیکن افضال' خاتون میمونہ کا گرویدہ ہوگیا اور اب وہ ان سے ایک ہی فرمائش کرتا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ اسے حاضرات کا علم سکھائیں۔ ماہر روحانیات خاتون میمونہ نے آخرکار اس بات پر رضامندی ظاہر کر دی اور افضال ان سے یہ علم سیکھنے لگا' پھر جس دن اس نے پہلی بار خود روح بلوائی اس دن وہ ساری رات خوشی سے سو نہیں سکا تھا' وہ ایک عجیب وغریب تجربہ کر رہا تھا اور اس میں مسلسل کامیابیاں حاصل کرتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن جب ایک دن اس نے خاتون میمونہ سے کہا۔

''میں کسی زندہ آدمی کی روح کو بلانا چاہتا ہوں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔ میں نے ایسا تجربہ کبھی نہیں کیا۔''

"لیکن میں یہ تجربہ ضرور کروں گا۔"

"نہیں بیٹا ایسے تجربات نہیں کرتے جن کا حکم ہمیں نہ ملا ہو۔"

"آپ کے خیال میں یہ ناممکن ہے۔"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتی مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ زندہ لوگوں کی روح کو بلانے کی ممانعت ہے۔"

لیکن دوسرے دن لوگوں کو اس بات کا علم ہوا کہ ملک کی ایک مشہور سرمایہ اور صنعت کار شخصیت باقر علی اچانک بے ہوش ہو گئے ہیں اور ان کی یہ بے ہوشی ان کی موت پر ختم ہوئی۔ خاتون میمونہ نے اس تجربے کو دیکھا تھا' لیکن افضال نے انہیں صرف اتنا بتایا۔

"ہاں میرے والد کے کاروباری حریف باقر علی نے کاروباری رقابت کے سبب میرے والد کو زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔"

"مگر ان کی موت کس طرح واقع ہوئی؟"

"میں نے ان کی روح کو بلانے کے بعد دائرے کی سوئی توڑ دی تھی اور اسے واپس نہیں بھیجا تھا۔" افضال نے مسکراتے ہوئے کہا اور خاتون میمونہ خوف سے ساکت ہو گئیں۔

کسی زندہ روح کو بلا کر یہ تجربہ کرنا کیسی عجیب بات تھی۔

ختم شد

تقدیر

آنسو اور قہقہے گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ پاس والے کمرے میں سبین کسی سے باتیں کر رہی تھی اور بات بات پر ہنس رہی تھی یہ اس کی عادت تھی' ہنسنے کی کوئی بات نہ ہوتی تو خود ہی کوئی چٹکلہ چھوڑ کر ہنستی ہنساتی رہتی' دوسری طرف شہلا کا چہرہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا' وہ بھی اپنے حالات سے مجبور تھی اگر رونے کی کوئی بات نہ ہوتی تو اپنے ماضی کی بدنصیبیوں کو یاد کر کے آنکھوں میں آنسو بھر لیتی تھی۔ دونوں سگی بہنیں تھیں ایک آنسوؤں سے گوندھی گئی تھی تو دوسری قہقہوں کی ریشمی انگلیوں سے تراشی گئی تھی۔ ریشم کے حسن' اس کی نزاکت' اس کی ملائمت اور اس کی گلابیت کو یکجا کرنے سے سبین کا سراپا مکمل ہو جاتا تھا۔ شہلا بڑی بہن تھی' اس کے ہاتھ ستاروں تک نہیں پہنچ پائے تھے اس لیے وہ روتی تھی۔

اس کی زندگی کا پہلا ستارہ شہباز تھا' کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے اور شہباز کے درمیان کوئی گھٹن پیدا ہو سکتی ہے۔ دونوں کا معاملہ تقریباً طے تھا۔ شہباز کے والدین شادی کی تاریخ مقرر کرنے آئے اور انہوں نے جہیز کی ایک فہرست شہلا کے گھر والوں کے سامنے رکھ دی' وہ باقاعدہ اس پر گفتگو کرتے رہے' بیس تولے سونا'

صوفہ سیٹ، ٹی وی، سی ڈی پلیئر، ریفریجریٹر، کار اور خاصی نقدی، سبین ششدر رہ گئی تھی، صاحب حیثیت لوگ تھے، سب کچھ دے سکتے تھے اور غالباً اس کے والدین اس کے لیے تیار بھی ہو گئے تھے لیکن سبین بری طرح بپھر گئی تھی۔

کیا میں اتنی بے حقیقت ہوں کہ جہیز میں لپیٹ کر سسرال بھیجی جاؤں اور اس نے ٹیلی فون کر کے شہباز کو خوب اچھی طرح سنا دیں۔ اتنا برا بھلا کہا اسے اور اس کے گھر والوں کو کہ زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد ہی شہباز کے والد نے فون پر کہا کہ وہ ایسی لڑکی کو کبھی اپنی بہو بنانے کا تصور نہیں کر سکتے جو ان کے بیٹے کو در در کا بھکاری کہے۔ یہ رشتہ ختم کیا ہوا ساری برادری روٹھ گئی۔ بس اس کے بعد بہت سے رشتے آئے لڑکے اچھے بھی تھے لیکن کھرے کھوٹے کی پہچان مشکل تھی۔

انتظار ایک پتھر ہے جو اپنی جگہ سے نہیں ہلتا اور وقت ایک دریا ہے جس کے بہنے کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ وقت کے اس دریا میں شہلا کی عمر کا بہت سا حصہ بہہ گیا۔ اب اس کا جسم کسی صحت مند شادی شدہ عورت کی طرح بھاری بھرکم ہو گیا تھا۔ زندگی کی یکسانیت اور خواہ مخواہ کی سوچ و فکر سے بچنے کے لیے اس نے ایک فرم میں ملازمت کر لی۔ رمیض اسی فرم میں اسسٹنٹ منیجر تھا۔ ایک خوش لباس اور خوش گفتار نوجوان۔ وہ جس بے تکلفی سے شہلا سے پیش آیا اس نے شہلا کی آنکھوں میں ایک بار پھر زندگی کو چمکا دیا۔ رمیض اس سے بہت زیادہ بے تکلف ہونے لگا تھا، وہ اس انداز میں شہلا سے پیش آتا کہ شہلا خوابوں میں کھو جاتی۔ اس نے بے تکلفی سے شہلا سے کہا۔

”پتہ نہیں مس شہلا، آپ کیوں اداس رہتی ہیں، آپ یقین کیجیے میری دلی خواہش ہے کہ آپ ہنستی بولتی نظر آئیں، میں سمجھتا ہوں کہ کوئی آئیڈیل کو سوچ کے خود اس ترنگ میں نہیں مسکراتا، آپ کو خود اپنے آپ کو دنیا کے سامنے محفوظ رکھنا ہے ورنہ دنیا آپ کو پیس کر رکھ دے گی۔“ اور شہلا کی راتیں جاگ اٹھیں، اب وہ اکثر رمیض کو

خوابوں میں دیکھتی تھی، لیکن پھر ایک دن اس کے یہ سارے خواب چکنا چور ہو گئے، جب اس نے رمیض اور سبین کو یکجا دیکھا۔ وہ دونوں اسے نہیں دیکھ سکے تھے لیکن شہلا نے انہیں دیکھا اور ان کی باتیں سنیں، اس وقت بالکل اتفاق سے اسی کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی اور رمیض کہہ رہا تھا۔

”ہاں یقین کرو سبین، بہت وقت کے بعد میں نے یہ جانا کہ شہلا تمہاری بہن ہے، بہرحال میں ان کے بارے میں کیا کہوں، جو کچھ تم کہہ رہی ہو وہ میرے لیے ممکن نہیں ہے سبین، میرے والدین پرانے خیالات کے حامل ہیں۔ وہ ستائیس برس کے بیٹے کے لیے تیس برس کی بہو لانا کبھی پسند نہیں کرینگے، یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ تم اپنی باجی سے بہت زیادہ محبت کرتی ہو لیکن تمہیں زندگی سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا ورنہ دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں، تم بھی روؤ گی اور تمہاری باجی بھی روئیں گی، بہتر ہے کہ باجی کو رونے دو، وقت کا کوئی بھی صابر لمحہ ان کے آنسو پونچھ کر گزر جائے گا۔“

”تم کتنی سنگدلی سے یہ باتیں کہہ رہے ہو رمیض، کتنی سنگدلی سے یہ باتیں کہہ رہے ہو؟“

”دیکھو! میری امی مجھ سے کئی بار کہہ چکی ہیں کہ وہ تمہارے گھر میرا رشتہ لے کر جائیں، بہت جلد وہ تمہارے پاس آنے والی ہیں۔ تم براہ کرم اپنے آپ کو سنبھالو۔“ لیکن شہلا نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

رمیض کے والدین سبین کا رشتہ لے کر آئے اور یہ رشتہ منظور کر لیا گیا اور اس رات سبین اس کی گود میں منہ چھپائے مسکرا رہی تھی کیونکہ ایک کو رونا تھا اور دوسری کو ہنسنا تھا، دونوں بہنیں تھیں۔ ایک قہقہوں کی ریشمی انگلیوں سے تراشی گئی تھی اور دوسری آنسوؤں سے گوندھی گئی تھی، یہی تو تقدیر ہوتی ہے۔

ختم شد

رُوحانی کلینک

میں کچھ نہیں کہوں گی سوائے اس کے کہ اللہ سب کو عقل دے، زندگی تو بہت مختصر سی چیز ہے، چند سانسیں ہی تو اپنی ہوتی ہیں اور بس، انہیں بھی چھیننے کی کوشش کرنا اچھی بات تو نہیں ہے، سوچتی ہوں اگر مجھے اس مرد خدا کا سہارا حاصل نہ ہوتا تو شاید کبھی کی مرکھپ گئی ہوتی اور وہ بھی حرام موت۔

پورا واقعہ یوں ہے کہ میں اور طاہر ایک ہی فرم میں نوکری کرتے تھے، میرے ماں باپ مر چکے تھے، بڑی بہن نے پالا پوسا تھا، پھر ان کی بھی شادی ہوگئی، شوہر ملک سے باہر تھے اور اکثر مطالبہ کرتے رہتے تھے کہ باجی بھی ان کے پاس آجائیں۔ لیکن باجی میری وجہ سے یہاں پھنسی ہوئی تھی، طاہر سے کوئی باقاعدہ عشق ومحبت کا چکر تو نہیں چلا، سادگی سے انہوں نے مجھ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور شادی کی پیشکش کر دی، بہت اچھے آدمی ہیں طاہر، میں نے انکار نہیں کیا۔ بہرحال طاہر نے اپنے خاندان کی مرضی کے خلاف یہ شادی کی تھی۔

میں دلہن بن کر گھر پہنچی تو میرے لیے نفرتوں کے سوا کچھ نہ تھا، ایک بیوہ نند تھی میری، ساس تھیں، طاہر تھے اور بھی ایک آدھ فرد تھا گھر میں، مجھے اپنی نند اور ساس کی

طرف سے شدید نفرتوں کا شکار ہونا پڑا، بدنصیبی یہ تھی کہ وہ تعویذ گنڈوں کی قائل تھیں۔ طاہر سے انہوں نے کئی بار مطالبہ کیا کہ مجھے چھوڑ دیا جائے، مجھ پر ہاتھ بھی اٹھایا گیا، مارا پیٹا گیا مجھے، یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک تھا، طاہر بیچارے پریشان رہا کرتے تھے میری وجہ سے، لیکن اس کے بعد کچھ اور کام ہونے لگا۔

طاہر گھر سے چلے جاتے تو مجھ پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے، طاہر نے میری نوکری چھڑا دی تھی اور خود ہی ملازمت کر رہے تھے، بہرحال میرے خلاف تعویذ گنڈوں کا کام شروع ہوگیا، ماں بیٹیاں نجانے کہاں کہاں ماری ماری پھرتی تھیں۔ ایک دفعہ صرف طاہر سے کہا تو طاہر نے جواب دیا کہ اللہ پر بھروسہ رکھوں۔ بہرحال یہ سارے چکر چل رہے تھے اور، میں سخت پریشان تھی۔ میرے تکیے کے نیچے سے تعویذ نکلتے تھے۔ دو تین بار خون کے چھینٹے میرے اپنے لباس پر ملے، میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

پھر ایک بار مجھے اپنی الماری میں بکرے کا ایک سر ملا تو میں خوفزدہ ہوگئی، باجی میرے بہنوئی کے پاس چلی گئی تھیں۔ میرا پرسان حال کوئی نہیں تھا، ایک دو سہیلیاں تھیں، کبھی کبھی ان سے مل آتی تھی، بہرحال اس کے بعد میں نے طاہر کے اندر بھی تبدیلیاں رونما ہوتے ہوئے دیکھیں۔ وہ مجھ سے بگڑے بگڑے رہنے لگے تھے۔ پوچھنے پر کچھ نہیں بتاتے تھے۔ میں اس کائنات میں تنہا رہ گئی تھی۔ میں سخت پریشان تھی، پھر ایک دن میں نے دن میں خواب دیکھا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں کہیں جا رہی ہوں، راستے میں قبرستان تھا، اس قبرستان کو دیکھ کر مجھے بڑا ڈر لگا، جیسے ہی میں قبرستان کے درمیان پہنچی تو اچانک ایک قبر سے ایک ڈھانچہ باہر نکل آیا وہ گلے سڑے کفن میں تھا، کفن درمیان سے جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا، اس کی شکل دیکھ کر میرے منہ سے بڑی

خوف کی چیخ نکل گئی' اس کی شکل بے حد ڈراؤنی تھی اور اس کے جسم سے جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں سرخ تھیں اور ان آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہاتھوں کے ناخن بہت بڑے بڑے اور خنجر کی طرح تیز تھے۔ ڈھانچے کی دونوں ٹانگوں پیچھے کی طرف مڑی ہوئی تھیں۔ وہ ڈھانچہ میری طرف بڑھنے لگا۔

میں نے ڈھانچے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر دوڑ لگا دی اور ڈھانچہ میرے پیچھے بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے اچانک مجھے بہت زور کی ٹھوکر لگی اور اس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک بہت پرانی قبر میں بند تھی' چاروں طرف اندھیرے کا راج تھا اور مجھے اپنا دم نکلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک میری قبر میں ایک ہاتھ داخل ہوا اور کسی نے مجھے قبر سے باہر کھینچ لیا۔ اس کے بعد میں قبرستان سے واپس بھاگی تو ایک طرف سے گزرتے ہوئے مجھے ایک جگہ نظر آئی اس پر روحانی کلینک کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ نجانے کیوں یہ نام میرے ذہن میں رہ گیا۔ بہرحال جب مجھے ہوش آیا تو میں خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی اور اپنے کمرے ہی میں بیٹھی ہوئی تھی' ساس اور نند مسلسل میرے خلاف کارروائیوں میں مصروف تھیں۔ اب تو میرا دل بھی اس دنیا سے اچاٹ ہو گیا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ مجھے خودکشی کر لینی چاہیے۔ طاہر کا سہارا بھی چھن گیا تھا اور دنیا میرے لیے بے مقصد ہی ہو گئی تھی۔

بس دیوانگی کا سا عالم طاری تھا۔ مجھے اپنی سہیلی رعنا کا خیال آیا جو نارتھ کراچی کے ایک علاقے سلیم اسکوائر میں رہتی تھی۔ میں نے سوچا کہ دل بہلانے کے لیے رعنا کے پاس کچھ دیر کے لیے چلی جاؤں' بیچاری کتنی ہی بار کہہ چکی تھی مگر میں تو اپنی ہی مشکل کا شکار تھی۔ میں رکشہ میں بیٹھ کر نارتھ کراچی چل پڑی۔ یوپی موڑ سے

تھوڑے فاصلے پر پہنچی تھی کہ بائیں ہاتھ پر مجھے ایک بورڈ نظر آیا جس پر روحانی کلینک لکھا ہوا تھا۔

بڑی حیرت ہوئی چونکہ یہ نام میرے ذہن میں اس دن سے آج تک موجود تھا۔ میں نے رکشہ رکوایا' پیسے ادا کیئے اور اتر کر اس طرف چل پڑی۔ یہ ایک ہومیو پیتھک کلینک تھا' یہاں ایک نرم مزاج اور مشفق خاتون شازیہ علی نے میرا استقبال کیا' ڈاکٹر شازیہ علی کے بارے میں شاید میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے میں ان کی شخصیت بیان کر سکوں۔ اس طرح دلاسے دیئے مجھے کہ مجھے یوں لگا جیسے باجی واپس آ گئی ہوں' لیکن اس وقت میری حیرت کی شدید انتہا نہ رہی جب ایک بزرگ اندر داخل ہوئے اور انہوں نے کہا۔

''شازیہ شام کو چار بجے چلنا ہے' خیال رکھیے گا۔'' مگر میرا تو سارا وجود ان بزرگ کو دیکھ کر لرزنے لگا تھا۔ یہ وہی بزرگ تھے جنہوں نے مجھے قبر سے باہر نکالا تھا' انہوں نے مجھے دیکھا' دیکھتے رہے پھر بولے۔

''بیٹھ جاؤ بیٹا بیٹھ جاؤ۔'' پھر انہوں نے ایک گلاس پانی طلب کیا اور پانی پڑھ کر مجھے پلایا' بیان نہیں کر سکتی کہ مجھے کتنی تقویت حاصل ہوئی تھی کہنے لگے۔

''نہیں پریشان ہونے کی بات نہیں ہے' شیطانی علم اپنا کام کرتے ہیں' لیکن اللہ کے کلام میں وہ برکت ہے کہ ہر طرح کے شیطانی علم فنا ہو جاتے ہیں۔ تم بالکل بے فکر رہو' تمہیں چند روز یہاں آنا پڑے گا' سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان کی عقلوں کو بھی سہارا دے دیا جائے گا' فکر مت کرو۔''

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ان بزرگ کا نام محمد علی قادری ہے اور یہ یہیں پر ہوا کرتے ہیں' اصل میں جب مشکلیں پیدا ہوتی ہیں تو مشکلوں کے حل بھی اللہ تعالیٰ خود ہی پیدا کر دیتا ہے۔ ان کے ہاتھوں پتہ نہیں کتنوں کو زندگی کی اُلجھنوں سے شفا ملی

تھی۔ میں بس تہہ دل سے ان کی شکر گزار ہوں' ان کی کاوشوں اور کوششوں سے سارے حالات ٹھیک ہو گئے' ساس نند کی عقلیں بھی ٹھکانے آ گئیں طاہر بھی صحیح ہو گئے' مجھے میرا گھر مل گیا۔ظاہر ہے کسی کو سانسوں کا خراج مل جائے تو اور کیا باقی رہ جاتا ہے' خداوند عالم انسان کو زندگی کی ہر مشکل سے دور رکھے' دعا گو ہوں میں ان کے لیے جنہوں نے مجھے میرا گھر دیا۔

ختم شد

احساس کی آگ

چوہدری صاحب ویسے بھی بڑے زبردست سماجی کارکن تھے' چھوٹی سی بستی کی ہر چیز کا خیال رکھنا ان کی ذمے داری تھی۔ کونسلر کے الیکشن میں کھڑے ہوئے تو کسی نے مقابلہ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا' بھلا اتنے اچھے آدمی کو ووٹ نہ دینا کیا معنی رکھتا ہے' بہرحال کونسلر ہو گئے تھے اور اب ان کے اختیارات بھی بڑھ گئے تھے۔ اس وقت بھی وہ اس بڑے کنویں کے پاس کھڑے ہوئے تھے' جس سے تقریباً آدھی بستی پانی استعمال کرتی تھی۔ کنویں پر اس وقت بہت سے لوگ جمع تھے۔ مرد عورتیں بڑھے اور بچے' ایک میلہ سا لگا ہوا تھا اور لوگ چوہدری صاحب کو دیکھ رہے تھے۔ وہ لوگوں کو بڑی بڑی باتیں بتا رہے تھے۔ ''پانی میں بڑی طاقت ہے۔''

''اور آگ۔'' کسی نے سوال کیا۔

''آگ میں بھی بڑی طاقت ہے بیٹے' آگ اور پانی دو ہی تو بڑی طاقتیں ہیں' آگ جو انسان کے دل کے اندر ہے اور پانی جو اس کی آنکھ میں ہے' جس کام کو آگ پورا نہیں کر سکتی اسے پانی پورا کر دیتا ہے۔''

لوگوں نے احترام سے گردن ہلائی' عین اسی وقت ایک غوطہ خور نے باہر نکل کر جال کو کنویں کے باہر الٹ دیا جال سے بہت سا کیچڑ زمین پر بکھر گیا۔ ایک دم بہت

سے لوگ دوڑے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کیچڑ میں کچھ ٹٹولنے لگے' مگر انہیں کیچڑ میں کچھ نہ ملا۔غوطہ خور نے خالی جال کو ہاتھ میں لے کر پھر کنویں میں چھلانگ لگائی۔کنویں کی صفائی ہو رہی تھی۔غوطہ خور کنویں کا گندا کیچڑ نکال کر باہر پھینک رہا تھا۔سارا کیچڑ باہر نکل آئے گا تو کنواں صاف ہو جائے گا۔حفظان صحت کے اصولوں کے تحت یہ ضروری تھا۔

غوطہ خور تھوڑی دیر کے بعد پھر باہر نکلا اور اس نے کیچڑ نیچے زمین پر بکھیر دیا۔ کیچڑ میں سے ایک کنگھی نکلی۔غوطہ خور نے پوچھا۔

''یہ کنگھی کس کی ہے؟'' ایک نوبیاہتا لڑکی نے شرما کر غوطہ خور کے ہاتھ سے کنگھی لے لی اور پھر شرمیلی نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔لڑکی کے بال سنہرے سنہرے اور لمبے تھے۔ چہرہ بیضوی' آنکھیں بڑی بڑی اور بھوری' کبھی کبھی جب ان آنکھوں میں آنسو آتے تھے تو وہ شفق کی طرح چمک اٹھتی تھیں۔ اس نے شوہر کی طرف رخ کر کے کہا۔

''یاد ہے۔''

''ہاں...... یاد ہے۔'' اس کے جوان شوہر نے آہستہ آہستہ سے کہا اور خواب میں کھو گیا۔

اسی کنویں کے کنارے اس نے اپنی شرمیلی کو پہلی بار دیکھا تھا جب وہ غسل کرنے سے پہلے اپنے سنہرے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور اس نے اپنا گھوڑا روک کر اس سے پانی مانگا تھا۔'پانی میں بڑی طاقت ہے' پانی میں بڑی محبت ہے۔' جوان شوہر نے اپنی نوبیاہتا بیوی کے ہاتھ سے کنگھی لے کر اسے ہونٹوں سے لگا لیا پھر اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔لڑکی نے اسے پانی پلانے سے پہلے کنگھی کنویں کی جگہ پر رکھ دی تھی' اس کے سنہرے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے اور جب وہ پانی پلا کر پلٹی تھی تو

نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا' اور اسی کشمکش میں کنگھی اُچھل کر کنویں میں جا گری تھی۔ یاد ہے' کس کو یاد نہیں ہوگا' ہاتھوں کا وہ پہلا لمس جب کنگھی پانی میں گر گئی تھی' جب نگاہ دل میں اتر گئی تھی۔ جب بالوں کی ہر کرن آفتاب بن گئی تھی' کسے یاد نہ ہوگا۔

غوطہ خور پھر باہر نکلا' باہر نکل کر پھر اس نے جال اُلٹ دیا' اب اس میں سے ایک لمبی سی چھری نکلی' چوہدری صاحب نے چھری کو ہاتھ میں لے کر پوچھا۔

''یہ چھری کس کی ہے۔'' مجمع میں سے کوئی نہ بولا' لیکن بہت سے لوگ اس چھری کو جانتے تھے' اس چھری کا دستہ ہاتھی کے دانت کا تھا اور بے حد خوبصورت تھا' یہ چھری جس نوجوان کی تھی وہ بھی اسی مجمع میں کھڑا تھا اور سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ اس نے اس ظالم تھانیدار کو قتل کر دیا تھا جو ان کے گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت کے درپے رہتا تھا' مگر اس نوجوان کے خلاف نہ تو کسی نے گواہی دی اور نہ کوئی ثبوت مل سکا' مقدمہ خارج ہو گیا اور جس نے گاؤں کی عزت لی تھی اس کا نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔ پانی کی لہروں نے اس چھری کو اس طرح لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا جس طرح ماں اپنے گنہگار بیٹے کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔ پانی میں بڑی طاقت ہے۔ پانی میں انتقام بھی ہے' نوجوان کی آنکھوں میں سرخی تیرنے لگی اچانک ہی وہ آگے بڑھا اور اس نے چوہدری صاحب کے سامنے ہاتھ پھیلا کر چھری اپنے قبضے میں کر لی اور فخر وغرور سے اس کی ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

غوطہ خور پھر جال باہر لایا' اب سیاہ رنگ کی کیچڑ میں ہاتھی کے دانت کی بہت سی چوڑیاں تھیں' گاؤں کی سب سے نوجوان بیوہ دھیرے دھیرے سسکنے لگی کیونکہ شادی کے روز ہی اس کے دولہا نے زہر کھا لیا تھا' اسے کسی اور لڑکی سے محبت تھی اور وہ لڑکی اس کی نہ ہو سکی' سہاگ رات کو اپنے شوہر کی لاش دیکھ کر وہ چیخ کر باہر بھاگ گی

اور اس نے ساری چوڑیاں اتار کر کنویں میں پھینک دی تھیں' آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور جھک کر ایک ایک چوڑی کو بڑی احتیاط سے اپنے دامن میں سمیٹنے لگی' جیسے وہ اپنی چوڑیاں نہیں اپنی نادیدہ حسرتیں گن رہی ہو۔ سب چوڑیاں اٹھا کر اس نے اپنے دامن میں ڈالیں اور پھر سر جھکائے وہاں سے چلی گئی۔

غوطہ خور پھر باہر نکلا اب کے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور سینہ زور زور سے حرکت کر رہا تھا' یوں لگتا تھا جیسے وہ بہت نیچے گہرے پانیوں سے کچھ ڈھونڈ کے لایا ہے' اس نے بڑی احتیاط سے جال کھولا۔ اب کے جال میں کیچڑ کم تھی ریت زیادہ تھی اور اس ریت میں ایک ننھے سے بچے کی لاش تھی' لوگ دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور غور سے بچے کی لاش دیکھنے لگے' ان سب کی آنکھوں میں وحشت پیدا ہو گئی تھی' چوہدری صاحب نے اس مردہ بچے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا لیا۔

''یہ بچہ کس کا ہے؟'' کوئی کچھ نہیں بولا' مردوں کے چہرے فق تھے' شادی شدہ عورتوں نے گھونگھٹ نکال لئے تھے' نوجوان کنواریوں کی نگاہیں جھک گئی تھیں۔

''یہ بچہ کس کا ہے؟'' چوہدری صاحب نے پھر سوال کیا' سب دم بخود چپ چاپ کنویں کے گرد حلقہ باندھے کھڑے تھے' کسی نے کوئی جواب نہیں دیا' چوہدری صاحب نے اپنے کندھے پر پڑے ہوئے انگوچھے سے بچے کا چہرہ صاف کیا جو بری طرح پھولا ہوا تھا اور بگڑ چکا تھا۔ وہ دیر تک بچے کے چہرے پر نگاہیں جمائے رہے پھر انہوں نے اسے اپنے انگوچھے میں لپیٹا اور اسے اس طرح بازوؤں میں بھر لیا جیسے وہ ان کا اپنا ہی بچہ ہو' ان کے وجود کی لرزشیں نمایاں تھیں اور اس کے بعد وہ تھکے تھکے قدموں سے وہاں سے واپس پلٹ پڑے۔

ختم شد

جنریشن گیپ

دادا جان کسی زمانے میں عدالت کے پیش کار تھے' ہزاروں مقدمے ان کے سامنے تکمیل کو پائے تھے چنانچہ ان کی عقل و فراست میں تو کوئی شک ہی نہیں تھا۔ مگر اس وقت بازی مجھ سے پڑ گئی تھی۔ کہنے لگے۔

دیکھو بیٹا! میری اور تمہاری عقل میں یہ فرق ہے' ہماری نسل دانشمندوں کی نسل ہے' ہم اپنے دشمنوں سے کہتے ہیں کہ وہ بہت طاقتور ہے' ہم احمق سے کہتے ہیں کہ وہ عقل مند ہے' اسے ذہنی شکست دینا کہتے ہیں' مگر تم نوجوان لوگ تم کمپلیکس کے مارے ہوئے ہو' صرف اپنی برتری کے خواہشمند۔''

''دادا جان آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہم نئے عہد کے لوگ ہیں اور یہ جنریشن گیپ۔''

''گدھے ہو تم گدھے ہو۔''

''ویری گڈ' آپ نے دیکھا' آپ اپنی بات کی خود تردید کر رہے ہیں' آپ مجھے میرے منہ پر گدھا کہہ رہے ہیں۔ مجھے عقل مند کہیے تاکہ......''

''مگر میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے' اگر تم میرے دشمن ہوتے تو میں تمہیں

عقل مند ہی قرار دیتا۔'' دادا جان نے کہا اور پھر منہ بنا کر بولے۔

''اصل میں جدید نسل کا المیہ ہی یہ ہے کہ وہ اندر سے کھوکھلی ہے' باہر صرف خول ہی خول ہے' تم لوگ محنت کرنا نہیں جانتے' تمہارے ہاں ایڈونچر نہیں ہے۔ تم میں وہ جوش نہیں ہے جو تمہاری عمر کے لوگوں میں ہمارے عہد میں تھا۔

''آپ ہزاروں بار یہ بات کہہ چکے ہیں۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''اس کے باوجود تم نے ہم سے کچھ نہیں سیکھا۔ تم تن آسان ہو' تم لوگوں میں جرأت نہیں ہوتی' میں سمجھتا ہوں تم لوگوں نے گھاس کھو دی ہے۔''

''آپ جو کچھ دل چاہے کہہ لیں دادا جان۔''

''بھئی بات اصل میں یہ ہے کہ مجھے مستقبل کا فیصلہ بھی تو کرنا ہے' یہ دولت یہ جائیداد میں نے اپنی محنت سے کمائی ہے اور جس وقت تک مجھے یہ علم نہ ہو جائے کہ تم اسے سنبھالنے کی حیثیت رکھتے ہو یا نہیں میں اسے تمہارے نام کیسے کر سکتا ہوں۔''

میرے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی' دادا جان کی یہ دولت میری زندگی کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ دادا جان نے کہا۔

''جب تک تم یہ ثابت نہیں کرو گے۔''

''مگر دادا جان آپ ہی کی ہدایت پر میں نے اتنی تعلیم حاصل کی ہے۔''

''بیٹے نصابی لیاقت کا عقل مندی سے کوئی تعلق نہیں۔ زندگی ایک بڑی درسگاہ ہے اور جس کے دل میں آگے بڑھنے کی امنگ اور سر میں ترقی کا سودا ہو وہی کامیاب ہوتا ہے' میاں دولت حاصل کرو دولت' شہرت حاصل کرو دنیا کو اپنے قدموں پر جھکاؤ' دنیا سے اپنا حصہ حاصل کرو' ورثے میں کچھ مل جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں دادا جان میں کچھ نہیں کر سکتا؟''

''نوجوانی سرکشی اور شوریدہ سری کا نام ہے بیٹا' دولت اور محبت نوجوانی کے یہی دو خواب ہوتے ہیں' چلو میں تمہیں دولت دے دوں گا' تم مجھے صرف ایک محبت ہی حاصل کر کے دکھا دو۔''

''سوچ لیجئے دادا جان برداشت کر پائیں گے؟''

''ہاں کیوں نہیں۔'' میں نے دادا جان کا چیلنج قبول کر لیا پھر ایک دن میں دادا جان کے ساتھ باہر نکلا تو دادا جان نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ جو لڑکی سامنے کھڑی ہے۔ وہ سفید شلوار قمیض میں کافی خوبصورت ہے اور غالباً کسی بس کا انتظار کر رہی ہے۔''

''افسوس دادا جان' آپ کی جمالیاتی حس عمر کے ساتھ ساتھ خاصی متاثر ہوئی ہے' اول تو یہ محترمہ جو سامنے کھڑی ہیں' یہ لڑکی نہیں ہے' ان کی عمر چالیس سال سے کچھ اوپر ہی ہو گی' دوسرے یہ کہ بالکل خوبصورت نہیں ہیں۔ ان کے بال سمندری گھاس کی طرح الجھے الجھے سے ہیں' مزید یہ کہ ان کے ہاتھ میں ٹوکری ہے جسے آپ غالباً پرس سمجھ رہے ہیں' اور اس ٹوکری میں گوبھی کا پھول اور مولیاں صاف نظر آ رہی ہیں۔'' دادا جان کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔

ہم آگے بڑھ گئے' پھر دادا جان بولے۔

''اور اس لڑکی کے متعلق کیا خیال ہے؟''

''دادا جان یہ خوبصورت ضرور ہے' لیکن مزاج کی کافی تیز معلوم ہوتی ہے' اس کے چہرے کی ہلکی سی سانولاہٹ۔''

''بس بس آگے بڑھو آگے بڑھو اور اس سے شادی کر کے دکھا دو۔''

''جی...... مم...... میں'' میں ہکلایا اور حیرت سے دادا جان کی صورت دیکھنے لگا۔

''کیوں...... دادا جان طنزیہ انداز میں بولے۔ ''سارے ولولے اور جوش

دھرے رہ گئے نا۔ یہی فرق ہے ہمارے عہد اور اس عہد کے نوجوانوں میں۔ ایک ہم تھے کہ تمہاری دادی کو بازار سے لے اڑے تھے۔ سترہ دن تک پولیس ہم دونوں کے آگے پیچھے بھاگتی رہی تھی' اس آنکھ مچولی کے بعد اٹھارویں دن ہم لوگ پولیس اسٹیشن پہنچے تو پولیس افسروں کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ آہ تمہاری دادی کتنی ہمت والی خاتون تھیں' اس نے پولیس کے سامنے کھل کر کہہ دیا تھا کہ وہ صرف میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ دادا جان نے کچھ اس طرح مجھے بھڑکایا کہ میں اس لڑکی کی جانب بڑھ گیا۔

اور پھر تھوڑے ہی دن کے بعد وہ لڑکی جس کا نام دردانہ تھا' میری شریک حیات بن چکی تھی۔ دادا جان نے اپنے وعدے کے مطابق اپنی بے پناہ دولت میرے حوالے کر دی پھر ایک دن میں نے ان کی آواز سنی۔

''آج کل کے نوجوانوں میں ایک خوبی ہے کرنل رحمان' یہ بڑی آسانی سے بیوقوف بن جاتے ہیں' تم نے دیکھا میں نے معاملات کیسی خوبی سے نمٹا دیئے۔ اگر میں یہ نہ کرتا تو یہ بیوقوف لڑکا ہرگز تمہاری لڑکی سے شادی نہ کرتا۔ غالباً اس کے اعصاب پر کوئی اور لڑکی سوار تھی۔ میں جب بھی اس سے بات کرتا وہ یہی تاثر دیتا کہ وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔''

''ایک فائدہ اور ہوا۔'' کرنل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ نہیں ہوگا کہ تمہارا پوتا کسی بات پر میری بیٹی سے کہے کہ تم نے مجھ سے میرے دادا کی دولت کے لالچ میں شادی کی ہے' اور نہ میری لڑکی اس سے کہہ سکے گی کہ میرے ابا نے تم جیسے شخص کے ساتھ مجھے باندھ دیا' جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا اور ٹھیک ہی رہے گا۔ بہرحال ان دونوں کی خوشیاں ہماری زندگی ہیں۔'' میں اور میری بیوی یہ باتیں سن رہے تھے میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور بولا۔

''سنا تم نے' یہ دونوں بزرگ حضرات کیا کہہ رہے ہیں۔ اصل میں یہ سمجھتے ہیں کہ نوجوان نسل ان سے زیادہ بیوقوف ہے' ہم نے کتنی آسانی سے انہیں بیوقوف بنا دیا' وہ ہنس پڑی اور پھر بولی۔

''شاید ان دونوں کو زندگی بھر اس بات کا علم نہ ہو کہ ہم نے ایک سال پہلے ہی ایک دوسرے کو منتخب کر لیا تھا۔ واہ کیا عمدگی سے معاملات نمٹے ہیں۔'' وہ مسکرا کر میرے سینے سے لپٹ گئی۔

ختم شد

احتیاط

بچوں کی تعلیم و تربیت آسان کام نہیں ہے، معمولی غفلت سے وہ بدتمیز ہو جاتے ہیں۔ تمام والدین کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ بچوں کی پرورش سلیقے سے کریں۔ ان کے سامنے آپس میں تلخ کلامی نہایت نقصان دہ ہوتی ہے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس دور کے بچے کسی بھی طرح ذہانت میں بڑوں سے کم نہیں ہوتے، مطلع ابر آلود دیکھ کر بھانپ لیتے ہیں کہ گرج چمک کے ساتھ بارش ہونے والی ہے۔

میرا اور میری بیوی کا ستارہ ہی گڑبڑ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ روز اول سے ہم دونوں کے درمیان کبھی نہیں بنی، حالانکہ ہم صاحب اولاد ہیں، لیکن میری بیوی کی زبان بہت تلخ ہے، اور جب مدمقابل اس قدر تلخ ہو تو پھر دوسرے کو بھی اتنی ہی تلخیوں کے درمیان گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ البتہ اس بات پر ہم دونوں ہمیشہ متفق رہے کہ بچوں کے سامنے کبھی بدزبانی نہ کی جائے اور اس سلسلے میں نے اور میری بیگم نے لڑنے کا ایک اچھوتا طریقہ ایجاد کیا ہے۔

جب بھی ہم دونوں کے مزاج گرم ہوتے ہیں بلکہ تقریباً روزانہ ہی ایسا ہوتا ہے تو ہم گول مول الفاظ میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ لیتے ہیں اور ہمارے بچے ٹکر ٹکر

ہمارا منہ دیکھتے ہیں۔ مجھے اکثر دفتر میں دیر ہو جاتی ہے اور میری بیوی صرف اس بات سے مجھ سے متنفر ہوتی ہے کہ میری خوبصورت سیکرٹری بھی میرے ساتھ اوور ٹائم کر رہی ہوتی ہے۔ لیکن بہرحال وہ ایک ذہین عورت ہے، وہ صرف ایک ٹھنڈی سانس بھرتی ہے اور نرم لہجے میں کہتی ہے۔

''آج رات ایک بدشکل جانور بڑی دیر سے گھر آیا تھا، اس کو یہ سوچنا چاہیے کہ گھر میں کوئی اس کا انتظار کرتا ہے، اگر آئندہ اس نے ایسی ذلیل حرکت کی تو اس کے لیے دروازہ نہیں کھلے گا اور وہ رات اسے کسی گندے نالے میں گزارنی ہوگی۔''

''وہ جانور کون تھا امی؟'' میرا بیٹا پوچھتا ہے۔

''معلوم نہیں بیٹا ہوگا کوئی جنگلی جانور، دنیا میں طرح طرح کے جانور ہوتے ہیں۔'' میں مسکرا کر کہتا ہوں۔

''ایک چڑیل جیسی عورت نے ہر وقت کتیا کی طرح مجھ پر بھونکنا شروع کر دیا ہے۔''

''ابو کون ہے وہ چڑیل۔'' میری بیٹی کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔

''ہے بیٹا ایک گھٹیا اور کمینی عورت تم اسے نہیں جانتیں، وہ روز بروز جھگڑالو اور بدصورت ہوتی جا رہی ہے۔''

ایک اور مثال لیجئے اگر میری بیوی میری اجازت کے بغیر کوئی معمولی چیز خرید لے تو میں اپنے خیالات یوں ظاہر کرتا ہوں۔

''اگر کوئی گدھی سمجھتی ہے کہ وہ محنت کی کمائی اس طرح ضائع کرتی رہے گی تو اسے شاید غلط فہمی ہے۔ اس کا شوہر اسے ایسی سزا دے گا کہ وہ یاد رکھے گی۔'' میری بیوی کہتی ہے۔

''ایک نہایت ہی بخیل بدمعاش ایک ایک پیسے پر جان دینے والا کنجوسی کی

عادت میں مبتلا ہے، وہ مکھی چوس خود چاہے کتنی کنجوسی کرتا رہے اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ دوسروں کو لباس تک نہ پہننے دے۔'' بچوں کو تجسس ہوتا ہے کہ گدھی کون ہے اور وہ مکھی چوس وغیرہ کن ہستیوں کے نام ہیں۔ جب وہ ہم سے پوچھتے ہیں تو ہم دونوں انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کو نہیں جانتے، ہم دونوں اس انداز میں لڑنے کے ماہر ہو چکے ہیں کہ بچوں کے سامنے نازک سے نازک مسئلے پر بھی ہم آزادانہ اظہار خیال کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

''کل ایک دوست کے ہاں تقریب تھی، میں نے وہاں ایک بن مانس کو دیکھا وہ ایک انتہائی منحوس اور بھدی بطخ کو نہایت مست انداز میں گھور رہا تھا۔ وہ بن مانس اس بطخ کا کزن ہے اسے یہ بتا دینا چاہیے کہ اس بطخ کو عاشقانہ انداز میں گھورنا چھوڑ دے ورنہ اس کی کھال میں بھس بھر دیا جائے گا۔'' میری بیوی زور سے ہنس کر بولی۔

''ایک گیدڑ کو لنڈے کی پتلون نصیب ہو گئی ہے وہ اسے شیر کی کھال سمجھ بیٹھا ہے، لیکن اسے معلوم ہونا چاہیے کہ قالین کے شیروں سے کوئی نہیں ڈرتا۔''

جو لوگ ایسی علامتی گفتگو کے عادی ہو جاتے ہیں ان کے ذخیرہ الفاظ میں چند مخصوص الفاظ کا اضافہ ہو جاتا ہے مثلاً میں جب اپنی بیوی سے لڑنے کا یہ مہذب طریقہ اختیار کرتا ہوں تو موٹی بھینس، مکار لومڑی، بدصورت بکری، غمزدہ بھیڑ وغیرہ جیسے لفظ بار بار استعمال کرتا ہوں، اسی طرح میری بیوی کو جلاد، بھیڑیا، اژدھا، بچھو، گیدڑ جیسے الفاظ استعمال کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ گویا ہم دونوں نے اپنی اپنی لغت ایجاد کر لی ہے۔

کل اتفاقاً میں نے اپنی بیٹی اور بیٹے کی گفتگو سنی وہ کھیل رہے تھے۔ انہیں میری موجودگی کا علم نہیں تھا، میری بیٹی اپنے بھائی سے کہہ رہی تھی۔

''وہ اژدھا تھوڑی دیر کے بعد باہر دفع ہو جائے گا پھر ہم امرود کھائیں گے۔''

میرے بیٹے نے جواب دیا۔

''لیکن وہ بدصورت بکری اپنی منحوس آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہو گی، کہیں ہم پکڑے نہ جائیں۔''

میں نے لپک کر ان دونوں کے کان پکڑ لیے۔ ''کم بختو! یہ اژدھا اور بکری کون ہیں؟

''ہمیں نہیں معلوم ابو۔''

دونوں نے معصومیت سے جواب دیا۔

''تم ابھی بدصورت بکری کسے کہہ رہے تھے؟ میں چیخا۔

''آپ اسے نہیں جانتے ابو وہ آپ کے لیے اجنبی ہے۔'' میرے بیٹے نے جواب دیا۔

''اور تم......'' میں نے اپنی بیٹی سے کہا۔

''تم اژدھا کسے کہہ رہی تھیں؟''

''آپ اسے نہیں جانتے ابو وہ آپ کے لیے اجنبی ہے۔''

میں ان کی پٹائی کرنے لگا، بدصورت بکری کے بارے میں مجھے ان سے اتفاق تھا مگر اژدھے کے بارے میں نہیں۔

ختم شد

کاش

گورکن نے قبر کو آخری شکل دے دی اور پیچھے ہٹ گیا' وہ اپنا ٹین کا ڈبہ پھاوڑہ اور دوسری چیزیں سمیٹنے لگا۔ تدفین میں شریک لوگ پیچھے ہٹ گئے' لیکن ڈاکٹر نہال قبر کے پاس سے نہ اٹھ پایا' تب اسے اپنے بازو پر کسی کا لمس محسوس ہوا' نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو ذاکر تھا' بری حالت ہو رہی تھی اس کی' بگڑا ہوا چہرہ تھا' آہستہ سے بولا۔

''اٹھو نہال! وہ ہماری برائیوں سے بہت دور چلی گئی۔'' ڈاکٹر نہال نے ذاکر کی شکل دیکھی اور اس کی سسکی نکل گئی۔ یہ دونوں اس کے شوہر تھے۔

عجیب داستان تھی جس کا آغاز کہیں سے بھی کر لیا جائے لیکن وہ وقت بہت موزوں تھا۔ جب ندا سہمے ہوئے خرگوش کی طرح یونیورسٹی میں اپنے شعبے کی تلاش میں بھٹکے بھٹکے قدموں سے چل رہی تھی اور ذاکر عباسی نے اس کی بھرپور مدد کی تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے گھائل ہو گئے تھے اور پھر یہ زخم بھر گئے کیونکہ دونوں ایک دوسرے کی زندگی کا مرکز بن گئے تھے۔ ندا دلہن بن کر ذاکر عباسی کے گھر آ گئی۔ خاصہ وقت پرسکون گزرا اور پھر گھریلو جھگڑے شروع ہو گئے۔

ذاکر عباسی کی والدہ شروع ہی سے شادی کے مخالف تھیں' دونوں بہنیں ان کی آری تھیں' چنانچہ صرف ایک سال گزرنے کے بعد ہزاروں خرابیاں ندا کے اندر نکل آئیں اور ان کے تذکرے نمک مرچ لگا کر ذاکر عباسی کو بتائے جانے لگے۔ ندا بے قصور تھی' لیکن ماں اور بہنوں کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ ذاکر کی ذہنی حالت کبھی کبھی بہت زیادہ خراب ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر نہال اس کا بچپن کا دوست تھا اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ یورپ چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو ذاکر کو اس نے خود تلاش کر لیا۔

معصوم فرشتہ صفت جو ڈاکٹری کے پیشے کے لیے موزوں تھا ہی نہیں۔ بہرحال شفا دی تھی قدرت نے اس کے ہاتھ میں' کلینک کھولا تو گردن اٹھانے کی فرصت نہ ملی لیکن ذاکر عباسی کو اس نے دل وُ جان سے قریب رکھا اور پھر اس دن ذاکر عباسی ٹوٹا پھوٹا اس کے پاس پہنچ گیا۔ نہال اس کی حالت دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا اس نے کہا۔

''ذاکر کیا ہوا؟''

''میں نے ندا کو طلاق دے دی۔''

''کیا؟'' ڈاکٹر نہال اچھل پڑا۔

''بس جذبات میں آ کر میں ایسا کر بیٹھا۔''

''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ یہ ساس نندوں کے گھریلو جھگڑے کبھی کبھی بہت بڑے حادثوں کا سبب بن جاتے ہیں' تمہیں احتیاط کرنا ہو گی۔

''ایک بات بتاؤں تمہیں' میں بہت جلد اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا' جو کچھ کر بیٹھا ہوں وہ تو مجھے مجبور کر رہا ہے کہ ابھی اس لمحے میں اپنی زندگی ختم کر لوں' ندا بے قصور تھی یہ بات میں جانتا ہوں۔''

''آہ بڑی جلد بازی کر گئے تم۔''

پھر نہال ہر لمحہ ہر قدم اس کے ساتھ رہا مفتیوں سے فتوے لئے گئے ذاکر نے

گھر تک چھوڑ دیا تھا' ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملا طلاق ہو چکی ہے۔ اب قانون قدرت کے مطابق اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ندا کسی اور شخص سے شادی کرے اور اس کے بعد وہ اسے طلاق دے' بڑا لمبا پراسس تھا' عدت کے یہ دن جو ندا اپنے ماں باپ کے گھر گزار رہی تھی۔ پھر اس کے بعد دوسرے شخص کا مسئلہ۔

''آہ یہ تو بڑی ہی سنگین بات ہو گی' ندا میری محبت ہے میں اسے کسی دوسرے کی آغوش میں......''

''ذاکر اسی لیے تو طلاق کو مذہب کا بدترین قانون قرار دیا گیا ہے۔''

''تب نہال میری نگاہ تمہارے سوا کسی اور طرف نہیں جاتی۔''

''کیا؟'' نہال اچھل پڑا۔

''ہاں میرے دوست' جس طرح زندگی کے ہر مرحلے پر تم نے میرا ساتھ دیا ہے اس وقت بھی مجھے تمہاری ضرورت ہے۔

''لیکن یار......''

''ٹھیک ہے سوچ لو...... منع کر سکتے ہو۔'' لیکن نہال نے شاید اسے زندگی میں کبھی کسی چیز کے لیے منع نہیں کیا تھا۔ ذاکر نے ندا کو مجبور کیا' ندا جو ذاکر کی یاد میں بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی بحالت مجبوری تیار ہو گئی۔ سادگی سے ڈاکٹر نہال سے اس کا نکاح کرا دیا گیا اور پھر ندا کی زندگی میں ایک اور کردار کا اضافہ ہوا۔

ڈاکٹر نہال زندگی بھر کی خوشیوں سے محروم ایک معصوم سی فطرت کا نوجوان تھا' حجلہ عروسی میں وہ کسی نوخیز لڑکی کی طرح شرماتا ہوا ندا کے سامنے پیش ہوا تھا۔ ندا کو یہ شخص بڑا انوکھا بڑا عجیب لگا اور اس کے بعد ڈاکٹر نہال نے جس طرح ندا کی پذیرائی کی ندا حیران رہ گئی۔ ڈاکٹر نہال نے اسے اپنی کہانی سناتے ہوئے کہا کہ ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ کوئی بھائی بہن نہیں تھا۔ غاصبوں نے ماں باپ کا چھوڑا ہوا

سارا ترکہ ضبط کر لیا' ایک ایسی شخصیت اسے ملی جو صرف ایک پھل والا تھا' اس پھل والے نے اسے پروان چڑھایا۔ پھل بیچ بیچ کر اس کی تعلیم مکمل کرائی یہاں تک کہ اسے یورپ بھجوا دیا' بس یہ اس کی آخری کہانی تھی اور اس کے بعد وہ دنیا چھوڑ گیا۔ ڈاکٹر نہال کسی دیوتا کی طرح اس کی پوجا کرتا تھا اور ندا ایک عجیب دہشت کا شکار ہو گئی تھی۔ یہ دل کمبخت بھی کیسا باغی ہوتا ہے' طرح طرح کی مصیبتوں میں انسان کو گرفتار کرتا ہے' عدت پوری ہونے کے بعد جب ڈاکٹر نہال نے اس سے کہا۔

''ندا اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم میری زندگی سے دور ہو جاؤ'' تو ندا چونک پڑی۔

''نہیں نہال' کہیں نہیں جاؤں گی میں۔''

''کیا؟'' نہال اچھل پڑا۔

''ہاں' فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے نا۔''

''مگر ذاکر کا کیا ہوگا؟''

''اسے اس کے کیے کی سزا بھگتنے دو۔'' نہال تو دنگ رہ گیا تھا لیکن ذاکر کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس پر دیوانگی سوار ہو گئی۔ وہ اس طرح بلک بلک کر ندا کے سامنے رویا کہ ندا پریشان ہو گئی' اس کے بعد یہ عجیب کشمکش شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر نہال ندا کو طلاق دینا چاہتا تھا' لیکن ندا نے اسے تنہائیوں میں روتے ہوئے دیکھا تھا' وہ اتنے اچھے شخص کو نہیں چھوڑنا چاہتی تھی' دوسری طرف اس کی نظر ذاکر پر جاتی تو اس کا دل سینے میں پھڑپھڑانے لگتا' ذاکر اس کا پہلا پیار تھا اور یہ شدت ندا کی روح کو کچوکے دینے لگی اور پھر ایک اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

ڈاکٹر کی بیوی تھی زہروں کے بارے میں جانتی تھی اس نے آخری خط ان دونوں کے نام لکھا جس میں اس نے ذاکر سے کہا کہ وہ اپنی پہلی محبت کو کبھی نہیں بھول

سکتی اور آخری محبت کو بھی نہیں۔ ڈاکٹر نہال جیسے فرشتہ صفت انسان کو چھوڑنا اس کے بس کی بات نہیں اس لیے وہ یہ دنیا چھوڑ رہی ہے۔

''کاش کاش تم اسے طلاق نہ دیتے۔'' ڈاکٹر نہال نے ذاکر کا سہارا لیتے ہوئے قبرستان سے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

''کاش کاش تم اسے طلاق دینے کے لیے نہ کہتے۔'' ذاکر عباسی کی آواز ابھری' اور اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

ختم شد

خدا ہے محبت

''یہ کوئی کلیسا معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے ٹوٹی پھوٹی دیواروں' اینٹوں کے ڈھیروں میں کھلے ہوئے خوبصورت پھولوں کو دیکھتے ہوئے کہا' ان پھولوں کے درمیان پتھر کی مقدس صلیب ایک طرف سے زمین میں دبی ہوئی تھی' بوڑھے گائیڈ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آہستہ سے بولا۔

''ہاں' یہ مقدس کلیسا ہی ہے۔''

''کیا یہ کسی زلزلے میں تباہ ہوا تھا؟''

''ہاں وہ جو گہرائیوں میں بستی دیکھ رہے ہو وہ بستی پوری کی پوری تباہ و برباد ہوگئی تھی اس زلزلے میں' حالانکہ یہ زلزلوں کی سرزمین نہیں ہے' لیکن یہاں کے رہنے والوں نے زلزلے کو آواز دی تھی' آخر انسان یہ کیوں نہیں سوچتا کہ آسمان کی بلندیوں پر کوئی اسے دیکھ رہا ہے اور جب اس کا غضب جوش میں آئے گا تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا۔'' گائیڈ کی آواز لرزنے لگی۔

''مگر اس کلیسا کی تباہی میں کوئی کہانی پوشیدہ ہے۔''

''کہانی ہی سمجھ لو۔ چاہے اس کہانی کو تم پھولوں کی طرح حسین اینجلا کی کہانی

سمجھ لو یا مسکراتے ہوئے انٹونیو کی کہانی' یا پھر خونخوار لارسن کی کہانی' انٹونیو کی عمر اکیس سال تھی' نجانے کہاں کہاں سے بھٹکتا ہوا سینٹ لازار کے علاقے میں آنکلا تھا' فادر یورینس کو مل گیا اور وہ اسے کلیسا میں لے آئے کیونکہ وہ آنکھوں سے اندھا تھا اور خطرہ تھا کہ کہیں نہ کہیں گر کر مر جائے گا' کیونکہ اطراف میں خوفناک گڑھے بھی تھے۔

اینجلا نے اسے سب سے پہلے خوش آمدید کہا تھا۔ سینٹ لازار کے اس کلیسا کا سب سے مقدس پھول' سب سے حسین لڑکی جو یسوع کے نام پر زندگی گزار رہی تھی اور اس نے اندھے انٹونیو کو دیکھا تو پیار سے بولی۔

''تم نے دنیا کب سے نہیں دیکھی؟''

''جب سے دنیا کا نام میرے علم میں آیا۔''

''کیا تم پیدائشی اندھے ہو؟''

''ہاں۔''

''آہ تب تو تم نے بارش کے بعد آسمان پر پڑ جانے والی دھنک کے رنگ بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔''

''ہاں نہیں دیکھے۔''

''اور زمین پر کھلے ہوئے یہ خوبصورت پھول۔''

''وہ بھی نہیں دیکھے۔'' انٹونیو کی حسین مسکراہٹ ابھری اور اینجلا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر پیار سے بولی۔

''میں تمہیں دنیا بھر کے بارے میں بتاؤں گی' حالانکہ میں نے بھی یہ دنیا نہیں دیکھی۔ فادر یورینس کہتے ہیں کہ اس وقت میں دو برس کی تھی جب میرے ماں باپ حادثے کا شکار ہو کر مر گئے۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں تھا' فادر یورینس مجھے یہاں لے آئے اور اس بات کو پندرہ سال گزر گئے گویا میں سترہ سال کی ہوں۔''

پھر اینجلا اسے مقدس گیت سناتی رہی اور انٹونیو مسکراتا رہا۔ ان دونوں کو ہر جگہ ساتھ دیکھا جاتا تھا ان کے پاکیزہ خیالات فرشتوں کی مانند تھے' لیکن لارسن جو صرف اینجلا کی وجہ سے چرچ میں جھوٹی عبادت کرنے آجاتا تھا۔ ان دونوں کو یکجا دیکھ کر کوئلہ ہو جاتا تھا' اس نے بستی کے سربراہ سے کہا۔

''مقدس کلیسا! ہم سب کے لیے قابل احترام ہے۔ یہ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے' میں سمجھتا ہوں فادر یورینس کی کوتاہیوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ فادر یورینس کو سمجھایا جائے یا پھر انہیں یہاں سے نکال دیا جائے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو لارسن۔ انہوں نے تو اس کلیسا کی تعمیر کی ہے۔''

''اور اب ان کی موجودگی میں کلیسا کی توہین ہو رہی ہے' وہ اندھا لڑکا اینجلا کے ساتھ رات کی تاریکیوں تک میں ایسی خفیہ جگہ پر دیکھا جاتا ہے جہاں صرف ایک دوسرے کا جسمانی قرب حاصل کرنے والے ہی پناہ لیتے ہیں۔''

فادر یورینس نے سربراہ کی بات سن کر کہا۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے وہ دو مقدس پھول ہیں اور میں اندھا نہیں ہوں۔''

لیکن پھر ایک دن لارسن نے انٹونیو کو قتل کر دیا' اس نے رائفل سے انٹونیو کے سینے کا نشانہ لیا اور دو فائر کئے' انٹونیو وہیں خاموش ہو گیا اور اینجلا کی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ لوگ انٹونیو کی لاش اٹھا کر چرچ میں لے آئے۔ لارسن بے شمار گواہوں کے ساتھ چرچ پہنچ گیا۔

''میں نے ان دونوں کو قابل اعتراض حالت میں دیکھا تھا' بات مذہب کی ہے' فادر یورینس جو نہیں کر سکتے تھے' وہ میں نے کر ڈالا۔ یہ لڑکی بدکار ہے اور وہ جو مر چکا۔'' اینجلا نے خونی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر اس نے اپنے لباس کی دھجیاں کر ڈالیں' ان دھجیوں کو اس نے چاروں طرف بکھیر دیا اور غرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''مقدس باپ! میں تیرے حضور حاضر ہوں۔ یہ جو کہتا ہے اگر یہ سچ ہے تو میرے اس بدن کو خاکستر کر دے اور اگر سچ نہیں ہے تو مقدس مریم! میری آبرو کی تصدیق کر' مقدس باپ اور عظیم ماں' میرا مقدمہ تیرے حضور درپیش ہے۔ اگر تو نے دنیا کو انصاف کی راہ نہ دکھائی تو نجانے کیا خیالات لے کر میں اس دنیا سے چلی جاؤں گیا۔ انٹونیو بے شک میرا محبوب تھا' لیکن تیرے تقدس کی قسم' ہمارے دلوں میں کبھی میل نہیں آیا تھا' بول مقدس ماں گواہی دے گی میری' تیری گواہی درکار ہے۔''

او میرے عزیز نوجوان دوست چاروں اطراف سے ایک گڑگڑاہٹ ابھری' زمین ہلنے لگی' مقدس مریم کی مجسمے پر سے پتھر کی چادر علیحدہ ہوئی' فضا میں اڑتی ہوئی آئی اور اینجلا کے بدن سے لپٹ گئی۔ فادر یورینس نے بستی کے سربراہ کو دیکھا اور پھر لارسن کو' ان کی گردنیں جھک گئی تھیں' لیکن دیواریں ہلنا ختم نہ ہوئیں بلکہ بڑھتی ہی چلی گئیں' کلیسا کے دروازے جام ہو گئے' نہ لارسن وہاں سے نکل سکا اور نہ وہ تمام لوگ جو مقدس عیسیٰ کا فیصلہ سننے کے لیے چرچ میں جمع تھے' یہ عظیم الشان دیواریں ڈھے گئیں' بستی فنا ہو گئی' جب کسی مظلوم کی آہیں آسمان تک پہنچ جاتی ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ آؤ یہاں سے واپس چلو مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔''

ختم شد

خود کردہ را علاج نیست

سردیوں کی برسات تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ دور دور تک کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا اور اس پر کمرے کی وحشت میری بے بسی کا مذاق الگ اُڑا رہی تھی۔ چار دیواروں اور ایک دروازے پر مشتمل یہ کمرہ ایسا لگ رہا تھا جیسے مرمر کے جی رہا ہو۔ برسات کے ساتھ آسمان کی بجلی کبھی کبھی کمرے کی تاریکی میں گویا ایک ہیجان پیدا کر دیتی اور دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو جاتی۔ ایسے میں کوشش کر کر کے تھک گیا' مگر نیند کو آنا تھا نہ آئی اور آتی بھی کیسے۔ صبح سے کھانا تک تو کھایا نہ تھا اور نہ ہی آج ڈاکٹر سے دوائی لی تھی۔ سر درد سے الگ پھٹا جا رہا تھا۔ اتنی سکت ہی نہ تھی جس میں کہ اٹھ کر کچھ کرتا۔ ویسے بھی اب جینے کا دل نہیں چاہتا تھا۔

زندگی میں سب کچھ تو ہار چکا تھا۔ جیت جانے کی آرزو میں ایسا گرا کہ دنیا مجھے روندتی ہوئی آگے نکل گئی اور میں دنیا کی بھیڑ میں بہت پیچھے رہ گیا اور اب جب درد اشک بن کر آنکھوں کے سمندر سے بہنے کو تھے تو میرے سارے جرم میرے سامنے تھے۔ ماضی کے اندھے خوابوں نے مجھے تنہائی کی اندھی کھائی میں پھینک دیا تھا جہاں زندگی ایک بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔ مگر اب شکایت کس سے کہ میں نے اپنی خواہشوں

کے کھنڈر کو خود وسیع کیا تھا اور اب ان کھنڈرات سے ٹکرا ٹکرا کر اپنے احساسات کو لہولہان کر بیٹھا ہوں تو جانے کیوں آج رمشہ بہت یاد آ رہی ہے۔ خیر مجھے حق تو نہیں پہنچتا کہ میں اپنی زبان سے اس کا نام بھی لیتا کیونکہ میں اس کو اس کے ناکردہ گناہوں کی ویسے بھی بہت کڑی سزا دے چکا ہوں۔

وہ میری جوانی کا عروج تھا۔ ظاہری دنیا کی رنگینیاں میرے وجود کے درمیان گھیرا ڈال چکی تھیں اور میں حصول دولت کی خاطر سارے رشتے ناتے توڑتا جا رہا تھا۔ رمشہ میری منگیتر ہی نہیں میری خالہ زاد بہن بھی تھی۔ وہ پڑھی لکھی تھی مگر مشرقیت کا پیکر، وہ خوبصورت تھی مگر سادگی پسند، زمانے کے ساتھ چلنے والی مگر باعزت، مجھے چاہنے والی مگر غریب، اس کی یہ تمام خوبیاں میری نظر میں خامیاں بن چکی تھیں اور میں نے ماں باپ کی لاکھ مخالفتوں کے باوجود بچپن کے اس رشتے کو ایک لمحے میں کانچ کی نازک چوڑیوں کی طرح توڑ ڈالا۔ محبت کے اس گلاب کو اپنے ہاتھوں سے مسل دیا۔ مگر اس محبت کی ماری نے میرے مسلے ہوئے پھول کو بھی اپنی زندگی کی کتاب میں لگا کر رکھ لیا۔ اپنے ماں باپ کے طعنوں سے بچنے کے لیے میں نے ان کا گھر بھی چھوڑ دیا۔

نوکری اچھی تھی میرے پاس۔ مجھے کس کی پروا تھی۔ رشوت اتنی تھی کہ دولت کی فراوانی سے دنیا کے سارے رشتے جھاگ بن کر بہہ گئے۔ وہ شام میرے لیے بڑی ہی تکلیف دہ تھی۔ میں ایک پارٹی میں جانے کے لیے گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ رمشہ میرے سامنے آ گئی۔ میں جواب اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور وہ تھی کہ مجھ سے محبت کی بھیک مانگنے آئی تھی۔ شادی کی خواہاں تھی مجھ سے۔ مگر میرے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ میں ایک اچھی پارٹی کو چھوڑ کر اس کی بے ہنگم باتیں سنتا۔ یہ ایک الگ بات تھی کہ کبھی مجھے اس کا باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ مگر اب نہیں۔ میں اسے

روتا چلاتا سسکتا چھوڑ کر پارٹی میں آ گیا۔

چند دنوں بعد دوسری ڈاک کے ساتھ رمشہ کا خط بھی ملا، لکھا تھا کہ اگر ایک ہفتے کے اندر اندر میں نے اسے نہ اپنایا تو وہ خودکشی کر لے گی۔

"پاگل" میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ دوسرے الفاظ میں گویا یہ میرے لیے دھمکی تھی مگر مجھے اب کیا پرواہ تھی۔ کاغذوں سے بھری ردی کی ٹوکری میں ایک کاغذ شامل ہونے سے میری صحت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ پھر تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ مجھے اس کی موت کی اطلاع مل گئی۔ چند لمحوں کے لیے بہرحال میرے احساسات نے مجھے جھنجھوڑا مگر پھر یہ احساس بھی زائل ہو گیا۔ آنے والا ہر نیا دن مجھے ترقی بخش رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دولت کے انبار لگ گئے۔ شادی کی کئی آفرز ہوئیں مگر میں نے محض اس لیے انکار کر دیا کہ میں اپنی دولت میں کسی کو حصہ دار نہیں بنانا چاہتا تھا اور پھر میری نظر میں شادی کے لیے تو ساری عمر پڑی تھی جبکہ دولت کمانے کے لیے جوانی کے یہی چند سال تھے۔ یوں زندگی کے چند برس عیش پرستی میں گزر گئے۔ پھر قدرت کی دی ہوئی لمبی رسی میرے ہاتھوں سے سرکنے لگی یا شاید میرا زوال شروع ہو گیا۔ یوں بھی رمشہ کی زندگی برباد کرنے کی سزا تو مجھے ملنی ہی تھی۔

ایک دن جب میں آفس میں بیٹھا ایک کلائنٹ کی طرف سے دی ہوئی رقم گن رہا تھا تو عین اسی وقت اچانک اینٹی کرپشن والوں نے چھاپہ مار کر مجھے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا۔ کئی دن جیل کی نذر ہو گئے۔ میری زندگی کی تمام کمائی اس کیس کو ختم کرانے پر صرف ہو گئی اور بالآخر ایک سال بعد میں اس کیس سے آزاد ہوا مگر اس کیس نے میری زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ آج احساس ہوا کہ زخم کیا ہوتا ہے، تکلیف کیسی ہوتی ہے؟ ایسے وقت میں اپنے بہت یاد آنے لگتے ہیں جو کم از کم تسلی تو دیتے ہیں، ڈھارس تو بندھاتے ہیں مگر میں تنہا تھا اس لیے کہ میں نے اپنوں کو چھوڑ کر دولت

سے پیار کیا مگر وہی دولت برے وقت میں میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ سچ ہی تو ہے کہ دولت اچھے وقت میں ساتھ دیتی ہے جبکہ اپنے ہر وقت ساتھ دیتے ہیں۔ مگر شاید میں پھر خوش ہوں کہ شاید یہی میری زندگی ہے۔ جس میں خوشیاں تو نہیں مگر اپنوں کی یادیں تو ہیں، لوگوں کے جھرمٹ سے دور تنہائی تو ہے۔ رہائی سے اچھی یہ قید ہے جو چار دیواری پر مشتمل ہے مگر رمشہ کی یادیں مجھے قید کا احساس ہونے نہیں دیتیں۔ شاید یہی زندگی کا حاصل ہے۔

ختم شد

گروتھ

اصولی طور پر ہر مسلمان کو جس کا کوئی تعلق انور بھائی سے ہے اس کو یہ دعا مانگنی چاہیے کہ معبود کریم انور بھائی سے بچانا کہیں وہ نازل نہ ہو جائیں، بذات خود انور بھائی برے آدمی نہیں ہیں لیکن بس ان کے نظریات بہت برے ہیں، بچوں کی تربیت کے سلسلے میں خصوصاً ان کا بہت ہی برا نظریہ ہے، بلکہ آج کل تو یہ ایک طرح کا فیشن چل نکلا ہے کہ بچوں کو روکو نہ ٹوکو۔ جو ان کا جی چاہے وہی کرنے دو، انور بھائی کا کہنا ہے اس سے بچوں کی بہت سی نفسیاتی الجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔ یعنی وہ الجھنیں جو بڑے ہونے پر انہیں لاحق ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ ایسی نفسیاتی ایجاد کا سہرا فرائیڈ کے سر ہے جس سے بڑا الجھنوں کا بانی اور گورکھ دھندے والا آج تک پیدا نہیں ہوا۔

انور بھائی کا کہنا ہے بچوں کو روک ٹوک سے ان کی گروتھ رک جاتی ہے اور وہ فرائیڈ کے اس نظریے پر بڑی پابندی سے عمل کرتے ہیں، نہ صرف عمل کرتے ہیں بلکہ صرف دو بچوں کے باپ ہو کر انہوں نے پورے خاندان پر قابو پایا ہوا ہے۔

بس اس دن دعا مانگنے سے رہ گئے تھے اور تیار ہو کر باہر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ارم بالکل تیار تھیں کہ انور بھائی نازل ہو گئے۔ ہمارے معاشرے کا

ایک زریں اصول ہے کہ اگر مہمان آ جائے تو آپ کہیں نہیں جاسکتے اسے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس سے گھنٹوں بات چیت کرنی پڑے گی آپ کو بات بے بات پر ہنسنا بھی پڑے گا۔ بہرحال اس دن انور بھائی، شاہینہ باجی اور اپنے دونوں سپاہیوں کے ساتھ نازل ہو گئے، شاہینہ باجی نے تو ارم سے باتیں کرنا شروع کر دیں اور انور بھائی مجھ سے مصروف ہو گئے۔

''اور سناؤ سیف کیا کر رہے ہو آج کل، کہیں باہر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔''

ہم لوگ تو ان باتوں میں مصروف تھے اور بچوں نے قالین پر کھڑے ہو کر چاروں طرف کمرے کے سامان کا یوں جائزہ لینا شروع کر دیا جیسے ہٹلر کی فوجیں اتحادی فوجوں کا جائزہ لے رہی ہوں۔ پھر اچانک ہی شازل کی خوفناک چیخ کمرے میں گونجی اور وہ ریڈیوگرام کی طرف لپکا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا، مگر بچوں کو کسی کے دل کے درد سے کیا غرض، چنانچہ شازل نے جلدی سے آگے بڑھ کر وہ ریکارڈ اٹھا لئے جو میں نے بڑی محنت سے جمع کئے تھے۔ شمیل نے ریڈیو کی سوئی گھمانا شروع کر دی، شازل اپنا پہلا مشغلہ چھوڑ کر شیلف پر چڑھ گیا اور کتابیں نکال نکال کر باہر پھینکنے لگا۔ شمیل کو بھی اپنا پہلا مشغلہ پسند نہیں آیا تو وہ اونچے کارنس پیس پر پڑے ہوئے گلدان کے پھول لالچی نگاہوں سے دیکھنے لگا، پھر ایک اسٹول اٹھا کر کارنس پیس پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا، میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''اور سناؤ سیف، بھئی کافی دن سے تم نے ہماری طرف بھی چکر نہیں لگایا۔''

''جی آؤں گا۔'' میں نے کانپتی ہوئی مری مری آواز میں کہا۔ اتنے میں ایک زور کا تڑاخہ ہوا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا۔ شمیل نے گلدان سے پھول گھسیٹنے کی کوشش میں گلدان ہی گھسیٹ لیا اور گلدان فرش پر گر کر ایک سو ایک ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا۔

شاہینہ باجی جلدی سے بولیں۔

''ارے ارے دیکھو ارم یہ وہی گلدان ہے نا جو تم عمرے پر جا کر سعودی عرب سے لے کر آئی تھیں۔''

''نہیں...... وہ تو پچھلے ہفتے ٹوٹ گیا تھا۔ جب آپ لوگ آئے تھے۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''اچھا......''

''جی ہاں جب آپ شازل کی سالگرہ کی دعوت دینے آئے تھے۔''

''مگر وہ تو دوسرا گلدان تھا'' شاہینہ باجی نے کہا۔

''جی ہاں ایسا ہی دوسرا تھا۔''

''کیوں ارم سیف اب باتوں کو بھولنے لگے ہیں نا، کونسا گلدان ٹوٹا تھا تمہیں یاد ہو گا؟''

''پپ...... پتہ نہیں۔'' ارم کی خوفزدہ آواز ابھری۔ اتنے میں ریڈیوگرام سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی اور میں نے دیکھا کہ شازل اور شمیل آپس میں لڑ رہے ہیں اور ریڈیو کے دونوں بٹن ریڈیو سے نکل کر ان کے ہاتھوں میں آ چکے ہیں۔ شمیل نے شازل کے گھونسہ مارا تو انور بھائی خوشی سے چیخے۔

''شاباش۔ یہ ہوئی نا بات۔'' مگر گھونسہ شازل پر پڑنے کے بجائے ریڈیوگرام کے کانچ پر پڑا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ شمیل ریڈیوگرام سے الگ کھڑا ہو کر بسورنے لگا۔

''ارے ارے نہیں بیٹا نہیں نہیں لو اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ آؤ ادھر آ جاؤ۔'' شاہینہ باجی نے جلدی سے شمیل کو اپنی آغوش میں گھسیٹ لیا۔ شازل گھونسے سے بچ گیا تھا اور بڑا خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر کتابوں کا

ریک سنبھال لیا' شمیل نے اس دلچسپ مشغلے میں شامل ہوتے ہوئے کتابوں سے تصویریں پھاڑ پھاڑ کر الگ کرنا شروع کر دیں۔ بچوں کو مطالعے کا کس قدر شوق ہوتا ہے یہ بات آج ہی سمجھ میں آئی تھی۔

دیوان غالب کے مصور ایڈیشن پر دونوں آپس میں جھگڑ پڑے اور اسے اپنی اپنی طرف کھینچنے لگے۔ کھینچنے میں آدھا دیوان شازل کے ہاتھ میں اور آدھا شمیل کے ہاتھ میں چلا گیا اور غالب زبان حال سے کہتا رہ گیا۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے

بچے بہت ہوشیار تھے' کسی ایک چیز پر قناعت نہیں کرنی چاہیے' کہیں مہمان جاؤ تو کم از کم گھر کے دوسرے معاملات پر بھی نگاہ رکھو' چنانچہ دونوں ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئے۔ اب یہ پتہ نہیں کہاں داخل ہوئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں پتہ چلا کہ کچن میں چلے گئے تھے۔ اور غالباً فریج نظر آ گیا تھا' ارم کے چہرے پر اضطراب کے آثار نمودار ہو گئے کیونکہ دونوں وہاں سے سنگترے اور سیب اور تربوز جو کٹا ہوا ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھا تھا اٹھا لائے تھے۔ کچھ کھا رہے تھے کچھ ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ ایک سیب میرے ماتھے پر بھی لگا اور وہاں سے اچھل کر دیوار پر لگنے والا تھا کہ انور بھائی نے ہنستے ہوئے بیچ ہی میں کیچ کر لیا اور میری طرف دیکھ کر فاتحانہ انداز میں بولے۔

''اب تو عادت چھوٹ گئی ہے' لیکن بچپن میں مَیں کرکٹ کا بہت عمدہ کھلاڑی تھا۔'' اس پر میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے ارم کا رنگ متغیر ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ شازل کی نگاہیں ارم کی نئی شیفون کی ساڑھی پر ہیں' بالکل نئی اور خوبصورت ساڑھی تھی جو جگہ جگہ زردوزی کے کام سے جھلمل جھلمل کر رہی تھی۔ معصوم

شازل کا دل اس ساڑھی کو دیکھ کر مچل گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جو تربوز کی قاشوں میں بھرے ہوئے تھے اوپر اٹھائے اور اپنی بہتی ہوئی ناک تربوز کی قاش پر صاف کرتے ہوئے جھجکتے جھجکتے آگے بڑھا۔

''نہ نہ بیٹے نہ...... سنو سنو'' ارم کی خوفزدہ آواز ابھری تو شاہینہ باجی ہنس کر بولیں۔

''واہ ...... شازل واہ...... آنٹی کو پکڑ لو...... پکڑ لو آنٹی کو...... آنٹی بڑی اچھی' ڈرنا نہیں آنٹی سے۔'' ماں کی شہہ پر شازل میاں ذرا دلیری سے آگے بڑھے ارم گھبرا کر ساڑھی کی طرف بھاگی اور شمیل نے خوش ہو کر تالی بجائی اور اس نئے کھیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ارم نے جلدی سے ساڑھی اٹھائی اور بچانے کے لیے پیچھے ہٹی' لیکن شازل نے ایک زوردار جھپٹا مار کر اپنے دونوں ہاتھوں سے ساڑھی پکڑ لی اور اپنا منہ اس میں چھپا لیا۔ تربوز کا گودا اور سنگترے کی کھائی ہوئی پھانکیں ناک اور گلے کا لعاب اس بے داغ ساڑھی کو جگہ جگہ سے منقش کرتا گیا۔ ارم کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا تھا' بہرحال جب خوب کھانے پینے کے بعد انور بھائی گھر واپس گئے تو کمرے کی کوئی چیز صحیح سلامت نہیں رہ گئی تھی۔ کتابیں گلدان ریڈیوگرام میز تپائیاں کرسیاں سب بے ترتیبی کی حالت میں اس طرح پڑی تھیں جیسے اس گھر پر ابھی پولیس نے چھاپہ مارا ہو ارم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور پھر اس نے کہا۔

''انشاء اللہ تعالیٰ ہم بھی اریب کو ایسی ہی تربیت دیں گے کہ وہ بڑا ہو کر ان کے گھر جائے اور ان کے سامان کا ستیاناس کر دے۔''

''آمین ثم آمین۔'' میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

ختم شد

مداوا

ان دنوں میں ایف اے کی طالبہ تھی۔ ہمارے کالج میں مخلوط تعلیم تھی لیکن لڑکیوں کی تعداد بہت کم تھی‘ اکنامکس میں تو صرف ہم دو ہی لڑکیاں تھیں۔ ایک میں اور دوسری میری ایک ذہین دوست زویا تھی۔ اسی پیریڈ میں ہمارے سامنے والی سیٹ پر ایک لڑکا زعیم بیٹھا کرتا تھا۔ یہ لڑکا بے حد سنجیدہ اور محنتی تھا۔ کالج کے شریر لڑکے اکثر اسے چھیڑنے کی کوشش کرتے لیکن وہ سب سے بے نیاز رہتا۔ اس کی سنجیدگی کی وجہ سے ہم دونوں اس کی بے حد عزت کرتے تھے لیکن ایک دن اس کی عزت کا بت پاش پاش ہوگیا۔ میں اور زویا کالج کے لان میں بیٹھے نوٹس بنا رہے تھے کہ مالی کے چھوٹے سے لڑکے نے ایک بند لفافہ لاکر دیا اور بتایا کہ یہ زویا کو دینا ہے۔

ہم نے جلدی جلدی لفافہ پھاڑا۔ اندر معطر کاغذ پر زویا کے نام محبت کا پیغام تھا۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ یہ زعیم کی طرف سے لکھا گیا تھا۔ زویا غصے سے سرخ ہوگئی۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ یہ خط پرنسپل صاحب کے حوالے کر دیا جائے لیکن مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ امتحان نزدیک ہیں ذرا سی بات پر زعیم کا مستقبل خراب ہو جائے گا۔ زویا بھی فطری طور پر رحمدل تھی وہ بھی یہ سزا دینے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ یہ خط یونین کے صدر کو دے دیا جائے وہ خود ہی اس مجنوں سے نبٹ لیں گے۔

یونین کا صدر بے حد زندہ دل اور شریر لڑکا تھا۔ خط لے کر اس نے اسی وقت یونین کا اجلاس طلب کیا اور تھوڑی دیر میں ایک اسکیم بنا کر ہم لڑکیوں کو بلایا‘ ان دنوں ایک ڈرامے میں کالج کا ماحول دکھایا جارہا تھا اور لڑکوں پر یہ ماحول چھایا ہوا تھا‘ چنانچہ یہ اسکیم بھی اس مشہور ڈرامے کی کہانی کے تحت تیار کی گئی تھی۔ اسکیم یہ طے کی گئی کہ کسی بہانے سے زعیم کو ایک جگہ بلا کر اس کی خوب پٹائی کی جائے۔ زویا کی طرف سے ایک خط لکھا گیا جس میں زعیم کی محبت کا حوصلہ افزاء جواب دے کر شام کے وقت اسے کالج کی نئی زیر تعمیر عمارت کے پاس ملنے کی ہدایت کی گئی۔ یہ عمارت شہر سے چھ سات میل دور تھی‘ لیکن وہ بے وقوف لڑکا دھوکے میں آ گیا۔

گھر آ کر میں نے اس مذاق کے خوفناک پہلو پر غور کیا تو میں ڈر گئی۔ وہ پندرہ بیس لڑکے زعیم کی پٹائی کے لیے تیار بیٹھے ہیں‘ بہت ممکن تھا کہ وہ جوش جذبات میں زعیم کی زیادہ مرمت کر ڈالیں اور بات بڑھ کر زویا کی بدنامی کا سبب بن جائے۔ میں نے جلدی سے اپنے بھائی کو آفس فون کیا تو بھائی موجود نہیں تھے‘ میں نے موبائل پر کال کی تو سگنل نہیں مل رہا تھا۔ پھر اچانک موبائل مل گیا اور میں نے بھائی کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا کہ کسی طرح وہاں پہنچ کر زعیم کو ساری صورتحال سے آگاہ کر دیں ورنہ وہ بیچارہ مارا جائے گا۔

بھائی اپنی گاڑی میں وقت مقررہ سے کچھ پہلے وہاں پہنچ گئے۔ کالج کے ایک فنکشن میں وہ زعیم سے مل چکے تھے اس لیے جیسے ہی زعیم وہاں پہنچا بھائی نے اس کا راستہ روک لیا اور ناصحانہ انداز میں اسے سارا پروگرام بتایا کر سمجھایا لڑکی کے چکر پڑنے کے بجائے میرے ساتھ واپس چلو‘ ورنہ آج تمہارا بھیجہ پھوٹ جائے گا۔ زعیم یہ سب کچھ حیرت سے سنتا رہا‘ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں وحشت سما گئی اس نے بھائی کا گریبان پکڑ لیا اور چیخنے لگا۔

"زویا ایسی نہیں ہوسکتی۔" اس کی چیخ پکار سن کر اندر سے کالج کے تمام چھپے ہوئے لڑکے باہر نکل آئے' زعیم نے وحشیانہ انداز میں سب کو گھورا اور ایک جھٹکے سے اپنی قمیص تار تار کر ڈالی۔ سب لوگ حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

یونین کا شریر صدر بھی حیرت کی تصویر بنا کر کھڑا تھا۔ زعیم بری طرح چیختا ہوا شہر کی طرف بھاگنے لگا۔ اس وقت تک سب یہ سمجھے کہ یہ ڈر گیا ہے مگر جب شام تک یہ خبر ہر طرف پھیل گئی کہ شہر کی مشہور شخصیت حاجی رحمت علی کا اکلوتا لڑکا زعیم پاگل ہو گیا ہے تو کسی کو یقین نہ آیا۔

تیسرے دن سب لڑکے اس کی عیادت کو گئے۔ اس کی بری حالت تھی' زنجیروں سے بندھا ہوا تھا پھر بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ بس ایک ہی جملہ اس کی زبان پر تھا۔ "زویا ایسی نہیں ہوسکتی' زویا ایسی کبھی نہیں ہوسکتی۔"

اس کے گھر والے اس حادثے کے پس منظر سے بے خبر تھے اور لڑکوں میں کسی میں بھی جرأت نہیں تھی کہ اس کے ماں باپ کو اس واقعہ کی حقیقت سے آگاہ کرتا۔ زویا کا ڈر کے مارے برا حشر تھا کیونکہ لوگ آ کر بتاتے تھے کہ زعیم کا باپ ہر لڑکے کو پکڑ پکڑ کر یہی سوال پوچھتا مجھے بتا دو یہ زویا کون ہے؟"

بہرحال یہ بات چھپی نہ رہ سکی اور جلد ہی یہ بے بنیاد اسکینڈل شہر کے ہر فرد کی زبان پر آ گیا۔ زویا کی بھی خوب بدنامی ہوئی۔ پھر اسے مینٹل ہاسپٹل میں منتقل کر دیا گیا' مدت تک وہاں رہنے کے باوجود وہ اب تک مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہو سکا۔ اس واقعے کے بعد کالج کی یونین کے صدر نے یونین ختم کر دی کیونکہ کالج کے ہر فرد کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا کہ ایک مذاق میں شروع ہونے والی بات اس قدر بھیانک حادثہ بن جائے گی۔ اب غلطی کا کوئی مداوا نہیں تھا......

ختم شد

شریفے

اس نے بڑے بڑے پاپڑ بیلے' اتنے بڑے شہر میں جگہ جگہ ماری ماری پھری' لیکن نوکری کہیں نہ ملی۔ بغیر رشوت دیئے اور محنت سے حاصل کی ہوئی اپنی فرسٹ کلاس ایم اے سیاست کی ڈگری پر حسرت سے نظر ڈالی' اس لمحے اس کا چھوٹا بیٹا اس کے دوپٹے کا پلو کھینچتا ہوا بولا۔

"امی ..... ابو آج بھی میرے ٹینس شوز نہیں لائے' کل سر ہمیں پی ٹی میں نہیں بٹھائیں گے۔"

اس نے بچے کو جواب دیئے بغیر کیلنڈر کی طرف دیکھا' بائیس تاریخ تھی اور ابھی تنخواہ ملنے میں نو دن باقی تھے۔ مہینہ اکتیس کا تھا' اس نے بچے کو حسب سابق صبر کی تلقین کی' وہی جملے جو اس نے اپنے بڑوں سے سنے تھے' لیکن بچے کو یہ درس ذرا بھی نہ بھایا' یہ جملے تو وہ کئی دنوں سے سن رہا تھا' اس نے بے اعتباری سے ماں کو دیکھا اور غصے میں اپنا مٹی کا کھلونا توڑ کر اسے ریزہ ریزہ کرنے لگا۔

رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے وہ سوچنے لگی' سیاست میں ایم اے کرنے کے باوجود اب تک اس نے سیاست سے کام کیوں نہ لیا' تب اس نے اپنے میاں کو سمجھایا۔

''کسی سفارش کا بندوبست کریں نا۔''

اس کے میاں کے ایک دوست ایک بڑے ادارے کے افسر کے دوست تھے' اس طرح کڑی سے کڑی ملا کر اسے ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازمت مل گئی۔ سیاست کی ڈگری تو ڈھول کا پڑا بن گئی' ہاں عملی سیاست کام آئی اور یوں دو ماہ بعد ترقی بھی مل گئی۔ جس شہر میں بے مثال محنت اور ہنر کی مٹی پلید ہوتی تھی وہاں اسے ملازمت مل جانا معجزے سے کم نہ تھا۔ لیکن جس طرح وہ اس ملازمت کو نبھاتی چلی آئی وہ اس سے بھی بڑا معجزہ تھا۔ وہ ہر محاذ پر خود اپنا دفاع کرتی قدم بڑھائے جا رہی تھی۔ یہ ذہانت و بلاغت حالات کی دین تھی۔

ملازمت کرتے ہوئے اسے چھ ماہ گزر گئے۔ یہ چھ ماہ یوں تو کبھی سست روی اور کبھی پھرتی سے گزرے لیکن اسے زندگی کا بڑا گہرا تجربہ اور مشاہدہ دے گئے۔ افسران کو اپنے کام سے خوش کرنا۔ ساتھیوں کی زندہ دلی کو بھگتنا اور اپنے معاونین جو وقت بے وقت کھیسیں نکال کر بے تکلفی کی کوشش میں لگے رہتے کو برتنا اس نے سیکھ لیا تھا۔ اس کی جانب اٹھنے والی ہر آنکھ اس سے جیسے کچھ کہتی نظر آتی اور وہ کہی ان کہی سب سمجھ کر بھی شان بے نیازی سے اور کبھی مسکرا کر ان سب مطالبات کو اپنے ظرف کے سب سے آخری خانے میں جمع کرتی جاتی' لیکن ایک آنکھ ...... جو دو آنکھیں مل کر ایک بن گئی تھی' جب کہنے سننے کی حد سے گزر گئی تو زبان بن بیٹھی اور ایک دن گویا ہوئی۔

''دیکھئے نا...... اس آفس میں اور بھی لڑکیاں اور خواتین ہیں' لیکن آپ......''

''سب سے نرالی ہیں' مختلف ہیں اور سپر بیوٹی بھی۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

دوسرے دن آئینہ میں غور سے اپنے آپ کو دیکھا۔ کوئی ایسی خوبی یا خاص بات

تو نہ تھی اس میں۔ عام لڑکیوں کی طرح تھی' لیکن جوانی بھرپور تھی اور وہ آنکھ جواب زبان بن چکی تھی کچھ ایسی قصیدہ گوئی کرتی جا رہی تھی کہ کیا ہی کسی شاعر اور ادیب نے اپنے ان داتا کی کی ہو گی۔ وہ ناسمجھی کے انداز میں ٹال مٹول کر جاتی' کبھی انجان بن جاتی۔ کبھی بات کو دوسری باتوں میں اڑا دیتی اس لیے کہ اسے نوکری کرنا تھی اور وہ جانتی تھی کہ اس سانپ کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ آفس میں معتبر اور پرہیزگار مشہور' باس کی ناک کا بال' اور اسے ابھی گھر کی گاڑی چلانا تھی۔ دو بچوں کی تعلیم۔ ایک بیوی نند اور ساس کی کفالت۔ تنہا اس کے میاں کی آمدنی ایک کنبے کے اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا' میاں سے ذکر کرتی تو غریب کا چین و سکون حرام ہو جاتا اور بچی کھچی انا کی بھی دھجیاں بکھر جاتیں۔ تب اس نے بڑے سلیقے سے سنا ڈالیں۔

''ٹھیک ہے اگر آپ ہمارے خلوص کو ٹھکرا رہی ہیں تو اللہ مالک ہے' آئندہ آپ کے پاس حرف شکایت لے کر نہیں آئیں گے چاہے ......'' وہ فوراً ان کا جملہ لے اڑی۔

''آپ کے خلوص کے پیش نظر ہی اپنے بچوں سے آپ کا غائبانہ تعارف کئی بار کرایا ہے اور وہ اپنے ماموں جان ......'' اس کا جملہ پورا سنے بغیر ہی وہ بھڑک اُٹھے۔

''آپ ہمارا دل دکھا کر اچھا نہیں کر رہی ہیں' ہم کوئی ایسے ویسے آدمی نہیں' خاندانی ہیں' دیانت دار اور سچے ہیں' جبھی تو آپ سے اپنے دل کا حال کہہ دیا' ہم تو آپ کی خدمت کرنا چاہ رہے تھے۔ کبھی آپ ہمیں آزما کر تو دیکھتیں' کبھی تو......'' غالباً جی بھر آنے کی وجہ سے آگے ان سے بولا نہ گیا۔

''اب میں آپ سے کچھ عرض کر سکتی ہوں۔'' وہ بولی تو ان کے چہرے پر کنوار پنے کی کلیاں کھل اٹھیں۔ تھوڑی دیر پہلے کی کدورت ایک دم ہی دور ہو گئی۔ ایک

باعصمت اور فرماں بردار کی طرح وہ بڑی معصومیت سے بولے۔

''ہم دل میں غبار نہیں رکھتے ...... کہیے کیا کہہ رہی ہیں؟''

''وہ دروازہ دیکھا ہے نا آپ نے؟''

''جی دیکھا ہے۔'' وہ سمجھے اپنے گھر کے دروازے کا نقشہ بتانے جا رہی ہیں۔

''تو فوراً نکل جایئے۔'' پہلی بار اس کی آواز میں کرختگی آ گئی۔

''جا رہے ہیں۔'' وہ جھلا کر بولے۔

''لیکن لیکن۔ دیکھئے آپ پچھتائیں گی۔'' وہ ایک دم ہی گھومے اور جھٹکے سے کیبن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے توہین معمولی نہ تھی۔ لہٰذا وہ واقعی چلے گئے' پھر بہت دنوں تک نہ آئے' لیکن دونوں کے درمیان آفس کی فائلوں اور کام سے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ بس یونہی رسمی رسمی ...... ہاں ان کی آنکھیں کبھی بھی بہت کچھ کہہ جاتیں۔

انتیس کا رمضان کا چاند نظر نہیں آیا' دوسرے روز تیس تاریخ تھی اور چاند نظر نہ آنے کے باوجود چاند رات لازمی تھی' اگلے دن سے روزے شروع ہو رہے تھے۔

''آپ کو چاند مبارک۔'' وہ اپنے آپ ہی دوپہر میں آ گئے۔

''آپ کو بھی۔'' وہ آہستگی سے سر جھکائے لکھتے ہوئے بولی۔

''ایک نظر ہمیں دیکھ تو لیجئے۔'' ایسی لجاجت جیسے ماہ مقدس کی رعایت سے خیرات مانگ رہے ہوں۔ اس نے نظر بھر کر انہیں دیکھا۔

''آپ تو یوں گھور رہی ہیں جیسے ......''

''آپ کو تکلیف کیا ہے آخر؟'' وہ جھلا کر بولی۔

''تکلیف ......'' بہت سادگی سے انہوں نے کہا اور پھر خود پر مظلومیت طاری کرتے ہوئے کرسی گھسیٹ کر بلا تکلف بیٹھ گئے۔ ''تکلیف تو بہت ہے...... بیوی

بیچاری...... ویسے تو ٹھیک ہے...... لیکن اب ...... اب آپ کو کیا بتائیں...... اسے ہماری پرواہ نہیں...... کیسے کیسے دکھ سہہ رہے ہیں۔ اب رمضان شریف آ گئے...... آپ نے تو کبھی ہمدردی سے پوچھا ہی نہیں خیر اب پوچھا لیا ہے تو پھر کبھی سہی۔ سردست تو یہی کافی ہے کہ آپ ناراض نہیں' بس ایک بار مسکرا دیجئے۔ کل سے تو رمضان شروع ہو رہے ہیں۔ وہ ہونٹ پھیلا کر مسکرائی۔ شاید انہیں اس مسکراہٹ سے بہت مایوسی ہوئی جب وہ شکریہ کہہ کر فوری طور پر اٹھ کر چلے گئے۔

رمضان کے چھ روزے بخیر وخوبی گزر گئے' ان کی شکل دور سے نظر آ جاتی تھی' لیکن کچھ ایسا تاثر لئے ہوئے جیسے بری طرح خفا ہوں اور منائے جانے کے انتظار میں۔ پھر ایک دن اسے ان سے کوئی کام پڑ گیا' انہیں بلانے کے بجائے وہ خود اٹھ کر چلی گئی' مبادا پھر تنہائی میں قصہ درد لے بیٹھیں' لیکن وہ سیٹ پر نہ تھے' وہ دو تین افسروں کے پاس بھی جھانک آئی لیکن وہ کہیں نہ ملے۔ واپسی میں اچانک وہ راہداری میں نظر آ گئے۔

''سنیئے معراج صاحب۔'' اس نے بڑے نرم لہجے میں آواز دی۔

''میں یہ فائل آپ کو دینے آئی تھی' اس میں ......'' لیکن وہ پوری بات سننے سے پہلے ہی جلد سے بولے۔

''آپ یہ فائل چپڑاسی کے ہاتھ بھجوا دیجئے اور جو کچھ پوچھنا ہو وہ بھی لکھ کر بھجوا دیں' میں روزے سے ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ تیزی سے نکلے چلے گئے۔

ختم شد

تجربہ

''خوشبو سے کہنا ڈولی کہ آج پلنگ کی چادریں ضرور دھو کر جائے تین دن سے ٹال رہی ہے۔''

ممی کی آواز ڈولی نے جانے سنی کہ نہیں البتہ خود خوشبو نے سن لی وہ پہلے ہی ڈھیر سارے کپڑے دھو کر پھیلا چکی تھی۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس نے چاروں چادریں پلاسٹک کے ٹب میں ڈال دیں۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ کام چور تھی' تیرہ سال کی جان جتنا کام وہ کرتی تھی شاید ہی کوئی کر سکتا' لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ بہت کمزور' دھان پان جیسی تھی' جب کپڑے نچوڑتی تو یوں لگتا جیسے پتلی پتلی کلائیوں میں خون ہوتا تو ابھی وہ بھی نچڑ کر ٹپک پڑتا' تیرہ سال کی ہونے کے باوجود وہ گیارہ برس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ شاید یہ بھی قدرت کا ایک مذاق تھا' باپ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا' جب تک ماں کی آنکھوں نے ساتھ دیا وہ خود گھروں میں کام کرتی تھی' لیکن اب پورے گھر کا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔ تین چھوٹے بہن بھائی ایک اندھی ماں اور وہ خود۔

ٹیلی ویژن پر پیش کئے جانے والے پروگراموں فلموں اور کتابوں نے ڈولی کو اس سے کہیں زیادہ سکھا دیا تھا جو اس کی عمر کا تقاضا تھا۔ دوسری طرف خوشبو تھی' ان

کلچرڈ اور جاہل۔ ڈولی کو دنیا سے روشناس کرنے میں ٹی وی فلم اور پیپر بیک شہہ پاروں کے علاوہ شازل کا بھی ہاتھ تھا۔ شازل اس کا کزن تھا اور اسٹیٹس میں رہتا تھا۔ وہ تین مہینوں کے لیے آیا ہوا تھا' اس نے ڈولی پر بڑی محنت کی تھی' یوں تو ماں باپ بھی اولاد کو پال پوس کر بڑا کرنے میں کم محنت نہیں کرتے لیکن شازل کی محنت سے ڈولی کی اٹھان کچھ زیادہ ہی تیز ہوگئی تھی۔

شازل اسٹیٹس سے آیا تھا جو جمہوریت کے مذہب کا سب سے بڑا گہوارہ تھا یعنی جہاں ایک بے روزگار سیاہ فام جو ''ڈول'' وصول کرنے کی طویل قطار میں کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا ہو' سڑک پر چوبیس فٹ لمبی گاڑی میں گزرنے والے گورے کو ''ہے'' کہہ کر اس کا پہلا نام لے کر کر وش کر سکتا تھا اور اسی طرح بڑے گھرانوں کی بیٹیاں پرفیوم میں ڈوبے رومال ناک پر رکھ کر ''سلمز'' میں جا کر اپنے گندے غریبوں میں بحرالکاہل کے اس پار دنیا کے سب سے بڑے ملک کے غریبوں کی حالت زار کے بارے میں دلدوز داستانیں اور مرنے کے بعد جنت میں نیک غریب لوگوں کے لیے اسپیشل مراعات کا اعلان کرنے والے کتابچے تقسیم کیا کرتی تھیں۔

''ہے'' اور ''ہائے'' کے تلفظ کے ساتھ ''ہے خوشبو'' کہہ کر شازل خوشبو کو کبھی کبھی وش کر لیا کرتے تھے اور وہ اور ڈولی اکثر اس کے بیک ورڈ ہونے پر افسوس کیا کرتے تھے کہ گندے کپڑے پہنتی ہے اور بال تک نہیں بناتی۔

بنی نوع انسان کی خدمت اور سوشل ورک میں بڑا چارم تھا اور اس چارم کے تحت شازل اور ڈولی خوشبو کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ ڈولی نے اس کی خاطر یہ قربانی دینا بھی گوارا کی کہ لپ اسٹک اور نیل پالش کا وہ پرانا اسٹاک جس کے شیڈ آؤٹ آف ڈیٹ ہو گئے تھے بڑی فراخدلی سے خوشبو کو پیش کئے' مگر اس احمق لڑکی نے یہ کہہ کر انہیں لینے سے انکار کر دیا کہ اماں کہتی ہیں کہ انہیں لگانے سے گناہ ہوتا ہے۔

ڈولی اور شازل یہ بات سن کر بہت ہنستے تھے اور ''پور گرل'' کہہ کر اس کی حالت پر آپس میں بہت ملال کیا تھا' ظاہر ہے ایسا مریض کتنا قابل رحم ہوتا ہے جو دوا کو گناہ سمجھ کر استعمال کرنے سے ہی انکار کر دے۔

شازل کا سبجیکٹ سائیکالوجی تھا' چنانچہ اس نے خوشبو کا اچھی طرح تجزیہ کیا تھا اور پھر ڈولی سے کہا تھا کہ خوشبو نفسیاتی مریض ہے اور اس کا علاج بھی نفسیاتی طریقے سے کرنا پڑے گا۔ اس کے دل میں خود یہ احساس پیدا کرنا پڑے گا کہ وہ کن چیزوں سے محروم ہے اور کن چیزوں کی اسے ضرورت ہے۔ آدمی زندہ ہوتا ہے تو زندگی کی ضرورتوں کو محسوس کر کے رہتا ہے' بس ذرا طریقے کے ساتھ اسے محسوس کرانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ڈولی خود بھی اس تجربے سے گزر چکی تھی' شازل اسے بہت سی ضرورتیں نامعلوم طریقے سے محسوس کرا چکا تھا اور پھر اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ زندگی کی کیسی نعمتوں سے محروم تھی۔ ان دونوں کی مثال سائنسدانوں کی سی اور خوشبو کی سفید چوہے کی سی تھی جس پر تجربے کئے جاتے ہیں' لیکن وہ دونوں تجربے کے لیے مناسب موقعے کی تلاش میں تھے اور آخر ایک دن انہیں موقع مل ہی گیا۔

ڈیڈی سرکاری کام سے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے' ممی کو صبح ہی صبح اپنے عزیزوں میں جانا پڑا جہاں کوئی میت ہو گئی تھی' ڈولی سے چلنے کو کہا اس نے جواب دیا۔

''اوہ نو ممی! مجھے تو ڈیڈ باڈی دیکھ کر ہی ڈر لگتا ہے۔''

ممی چلی گئیں تو شازل نے ڈولی سے کہا کہ آج ہم پہلا تجربہ کریں گے جوان کلچرڈ لوگ کاسمیٹکس سے ڈرتے ہیں وہ اپنی فطری جبلت کو نہیں دبا سکتے اور پھولوں میں ضرور دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خوشبو کی چیزوں میں پھول خالص اور قدرتی

ہوتے ہیں۔ ہم کچھ پھول رکھ دیں گے اور دیکھ لینا خوشبو کی ضرور اس میں سے ایک دو پھول لے کر اگر بالوں میں نہیں لگا لے گی تو دوپٹے کے پلو میں ضرور باندھ لے گی اور گھر لے جائے گی۔

ڈولی اس تجربے سے بڑی ایکسائیٹڈ تھی' گلاب کے پھول اور چنبیلی کی کلیاں لائی گئیں اور انہیں احتیاط کے ساتھ گن کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیا گیا۔ چوبیس پھول تھے اور تیس کلیاں تھیں' یہ تعداد نوٹ کر لی گئی تاکہ یاد رہے اور پھر دونوں سائنسدان ڈرائنگ روم میں جا کر اپنی اپنی پسند کی موسیقی ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ خوشبو اپنے وقت پر آئی اور دونوں نے اسے وش کیا اور خوشبو اپنا کام کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد ڈولی نے وہیں سے آواز دے کر اس سے کہا کہ ڈائننگ ٹیبل ضرور صاف کر دینا۔ یہ ہدایت اس لیے ضروری تھی کہ نجانے اس بیوقوف کی نظر پھولوں پر پڑتی کہ نہیں۔

پھر جب تک خوشبو کام کرتی رہی' دونوں سائنسدان ڈرائنگ روم سے باہر نہیں نکلے۔ وہ خوشبو کو پورا احساس دلا دینا چاہتے تھے کہ باقی گھر اکیلا ہے اور کوئی اسے دیکھ نہیں رہا ہے۔ ویسے دونوں کے کان موسیقی سے زیادہ ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے جو خوشبو کے کام کرنے کی آوازیں تھیں' دبی زبان سے ایک دوسرے کو بتاتے جا رہے تھے کہ اب جھاڑ پونچھ ہو رہی ہے' اب پوچا لگایا جا رہا ہے' اب کپڑے دھوئے جا رہے ہیں وغیرہ۔

شازل کو اپنے تجربے کی کامیابی کا پورا یقین تھا' انہوں نے ڈولی سے کہا کہ آدمی زندہ ہوتا ہے تو اس کی فطری جبلت بھی زندہ ہوتی ہے اور جب بھی موقع ملے وہ اس فطری جبلت کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت وہ کتنے پھول اور کتنی کلیاں اٹھاتی ہے' اس سے اس کے جذبے کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکے گا اور اس کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ مریض کو اگلی خوراک کس ''پوٹینسی''

میں دی جائے۔

جیسے ہی خوشبو اپنا کام ختم کر کے سلام بی بی جی کہتی ہوئی چلی گئی' دونوں کے دونوں دوڑے دوڑے ڈائننگ روم میں آئے جلدی جلدی پھول اور کلیاں گنیں لیکن مایوسی سے دونوں کے منہ لٹک گئے۔ تمام پھول اور کلیاں اسی طرح موجود تھیں۔ البتہ ناشتے میں بچے ہوئے تین توس غائب تھے۔ شازل نے ڈولی کو بتایا کہ

''خوشبو مر چکی ہے' اس میں زندگی ہے ہی نہیں۔''

ختم شد

مایوسی گناہ ہے

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے امتحان ضرور لیتا ہے۔ غم اور خوشیاں دیتا ہے' جہاں انسان کی سوچ ختم ہو جاتی ہے' وہاں سے اس کو عطاء کرتا ہے اور اپنے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ میری زندگی کے اس واقعے نے میرے ایمان کو اتنا ہی پختہ کر دیا ہے۔ میں تقریباً بارہ سال سے اپنی فیملی کے ساتھ سعودیہ کے شہر مکہ مکرمہ میں مقیم ہوں۔ یہ واقعہ آج سے دس سال پہلے کا ہے۔ ہم نے سابقہ دستور کے مطابق ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی عمرہ کی تیاری کی۔ کیونکہ عیدالفطر آنے والی تھی اس لیے میری بیگم نے پورے گھر کی مکمل صفائی کی۔ پھر میں میری بیوی اور میرے تینوں بیٹے حمزہ، عمر اور رمیض عمرے کے لیے چل پڑے۔ ہم نے مسجد عمرہ گئے' احرام باندھا اور عمرے کی نیت کر کے سیدھے خانہ کعبہ جا پہنچے۔

پروگرام یہ بنا تھا کہ عمرہ کر کے پنجاب ہوٹل جو کہ محلّہ مسفلہ میں ہے' وہاں کھانا کھائیں گے۔ خانہ کعبہ میں رمضان کی ستائیس تاریخ کو حج اکبر سے بھی زیادہ رش ہوتا ہے' خیر عمرہ ادا کرنے کے بعد میں نے بیوی سے کہا کہ چلو ہوٹل کھانا کھانے چلتے ہیں۔ لیکن اس نے کہا کہ میں کافی تھک چکی ہوں آپ ہمارے لیے پارسل لے کر

آ جائیں' میں نے کہا کہ بچوں کا خاص خیال رکھنا' خصوصاً چھوٹے بیٹے رمیض کا۔ اس وقت رمیض کی عمر دو سال تھی۔ بہر حال میں ہوٹل جا پہنچا' وہاں لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ سے ایک گھنٹے کے بعد میری باری آئی۔ کھانا لے کر آیا تو دیکھا کہ میرے دونوں بڑے لڑکے اگلی صفوں میں گھوم رہے ہیں۔ میں حیران ہوا کہ ان کو تو اپنی ماں کے ساتھ بیٹھنا چاہیے تھا' خیر جب قریب گیا تو معلوم ہوا کہ رمیض گم ہو گیا ہے۔

یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یا خدا کیا ہوگا' لیکن اتنا یقین تھا کہ یہاں کافی سختی ہوتی ہے کہیں کھو گیا ہوگا۔ کوئی شرطہ والا اس کو لے آئے گا جہاں گمشدہ بچے رکھے جاتے ہیں۔ یہ کمرہ حرم شریف کے ساتھ ہے' میں جب بیوی کے پاس گیا تو وہ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ پریشان نہ ہو ابھی بچہ مل جائے گا' لیکن ماں کا دل تھا کہنے لگی کہ میرے دل میں وسوسے اور ہول آ رہے ہیں' خدا خیر کرے۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ کھانا دھرے کا دھرا رہ گیا' ان کو میں نے گھر روانہ کیا' کافی ٹھنڈ پڑ رہی تھی' میں اکیلا خدا کے آسرے پر بچے کو تلاش کرتا رہا۔ پوری رات تلاش جاری رہی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد تھانے جاتا کہ معلوم ہو کہ شاید کوئی میرے بچے کو چھوڑ گیا ہو۔ لیکن کچھ خبر نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے وہ رات آنکھوں میں کاٹی اور بغیر سحری کئے روزہ رکھا۔

دوسرے دن پھر شرطے سے معلوم کیا کہ کوئی خبر کوئی جواب ملا' ابھی تک کوئی خبر نہیں آئی۔ اطمینان رکھیں' اللہ بہتری فرمائے گا' لیکن مجھے کب سکون ملتا۔ میرا بیٹا گم ہو گیا تھا اور سکون کوسوں دور تھا۔ دوسرے دن میں نے تھانے میں پرچہ درج کرا دیا کیونکہ چند دوستوں نے کہا کہ یہ کیس اغواء کا ہے اور اگر کسی کو ملا ہوتا تو اتنا وقت اپنے پاس رکھ کر قانون کی خلاف ورزی نہ کرتا۔ بڑی مشکل سے پرچہ ہوا کیونکہ وہاں تک شنوائی نہیں تھی۔ ایک عربی دوست کو ساتھ لے کر یہ کارروائی مکمل کی اسی طرح دن

گزرتے رہے اور بچے کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔

ادھر میری بیوی کا برا حال تھا' وہ غمزدہ اور بچے کی جدائی میں پریشان تھی' اس کی دل سوز اور رقت آمیز باتیں سن کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ میں اس کو کافی حد تک سمجھاتا کہ انشاء اللہ ہمارا بچہ ایک دن ضرور لوٹے گا۔ وہ کہتی تم باپ ہو میں تو ماں ہوں' میں تو اس کے بغیر ایک گھڑی بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ یونہی دن پر دن گزرتے گئے روزانہ تھانے حاضری دیتا کہ کہیں سے کوئی خبر آ جائے' ایک دن اخبار کے دفتر گیا کہ گمشدگی کا اشتہار تصویر کے ساتھ دینا ہے انہوں نے کہا کہ یہاں تصویر ممنوع ہے اور ہم مجبور ہیں۔ پھر تھانے گیا آخر میں انہوں نے مجھ سے بچے کی تصاویر طلب کیں اور انہیں فیکس کے ذریعے پورے سعودیہ میں پھیلا دیا۔ اس کے بعد میں ایک دوست کے پاس گیا اسے سارا ماجرہ سنایا تو وہ مجھے ساتھ لے کر مدینہ روڈ پر نکل پڑا۔ راستے میں وادی فاطمہ کے قریب ایک دیہات ہے' وہاں لے گیا' میں حیران تھا کہ یہ یہاں کیوں لے آیا ہے۔ وہاں جا کر ایک بڑے گھر کے سامنے گاڑی روکی تھی' گھنٹی دی دروازہ کھلا اور ایک آدمی ہمارے سامنے تھا۔ پرنور چہرہ سفید ڈاڑھی' سفید لباس میں ملبوس ان بزرگ نے ہمیں اندر برآمدے میں بٹھایا اور پھر اندرونی حصے میں چلے گئے۔ میں نے اپنے سعودی دوست سے پوچھا کہ مجھے یہاں کیوں لائے ہو تو اس نے کہا کہ یہ شخص عامل ہے اور اپنے علم کے زور پر بتائے گا کہ بچہ کس کے پاس ہے اور کب ملے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بزرگ ہمارے لیے چائے لے آئے تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میرے دوست نے بزرگ کو بچے کی گمشدگی کا واقعہ بتایا اور اس کی بازیابی کے لیے حساب کرنے کو کہا۔ بزرگ نے ایک بڑا طشت منگوایا اس میں نیل ڈال کر اس کا رنگ نیلا کیا۔ پھر دو نوجوان حبشی لڑکیوں کو بلایا اور طشت کے پاس دوزانو بٹھا دیا' لڑکیوں نے اپنے سر اس طرح ڈھک لئے تھے کہ ان

کے منہ طشت کی طرف تھے۔ بزرگ عامل نے بہت سارا کلام اور جنوں کے لیے احکامات پڑھے' بعد میں لڑکیوں سے پوچھا کہ بتاؤ بچہ کہاں ہے؟ لڑکیاں جو سر ڈھانپ کر طشت کے پانی کا مشاہدہ کر رہی تھیں بتایا کہ لڑکا مکے کے شہر محلّہ معابدہ میں ایک لمبے قد کے آدمی کے پاس ہے اور اس وقت کھلونوں سے کھیل رہا ہے۔

اس کے بعد بزرگ نے کچھ دعائیں میرے لیے اور میری بیوی کے لیے دیں کہ یہ پڑھو اور جس جگہ بچہ گم ہوا تھا وہاں جا کر پڑھو۔ اور بچہ چار دن سے پہلے نہیں ملے گا اور اس کی خبر تم تک آ جائے گی۔ میں نے نذرانہ کے لیے کہا تو بزرگ نے کہا کہ یہ کام میں نے فی سبیل اللہ کیا ہے' جب بچہ ملے تو ایک بکرا خدا کے نام پر ذبح کر دینا اور میں کچھ نہیں لوں گا۔ میں اسی وقت گھر آیا' بیوی کو نیند سے اٹھایا اور ہم حرم شریف پہنچے جہاں بچہ گم ہوا تھا۔ بتائے گئے عمل کے مطابق دعائیں اور وظائف اور نوافل پڑھے' لیکن بچہ ندارد۔ مزید پریشانی لاحق ہو گئی' مسلسل وہاں جاتے رہے' دوسرے بچے پوچھتے کہ رمیض ملا۔ ہم کہتے کہ انشاء اللہ جلد ہی آ جائے گا۔ آخر کار ایک دن میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ میں حرم شریف میں بیٹھ کر اس قدر رویا اور اتنی دعائیں کیں کہ مجھے یہ بھی احساس نہ رہا کہ کب سے میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں' خیر گھر پہنچا تو وہاں بیوی کی حالت اور بھی خراب تھی' مجھے دیکھتے ہی بلک بلک کر رونے لگی اور پوچھتی کہ رمیض کو لے کر کیوں نہیں آئے' اس کو دیکھ کر میں بھی خوب رویا شاید یہی رونا خدا کو پسند آ گیا اور اسی وقت فون کی بیل مسلسل بجنے لگی تھی۔ میں نے دوڑ کر رسیور اٹھایا تو پتہ چلا کہ سعودی انٹیلی جنس کے محکمہ کی طرف سے فون تھا۔ ان سے پتہ چلا کہ ایک آدمی کو گرفتار کیا گیا ہے اور ایک بچہ بھی اس کے پاس ہے۔ آؤ اور شناخت کرو۔ میں تو یہ سن کر بدحواسی کے عالم میں بھاگا۔ وہاں پہنچ کر میں نے بچے کو پہچان لیا تھا۔

میں اس وقت خدا کے حضور سجدے میں گر پڑا اور خدا کی وحدانیت اور اس کی نعمت کا شکر بجا لانے لگا' پھر میں نے ایک بھرپور محفل میلاد کا پروگرام بنایا اور جس طرح وعدہ کیا تھا ایک کے بجائے دو بکرے خدا کے نام پر ذبح کیے۔ اس واقعے کے بعد سے اس بات پر میرا ایمان اور پختہ ہو گیا کہ خدا اپنے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔

ختم شد

قدرت کا فیصلہ

اللہ کے کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتے جن کی ایک مثال میری زندگی کا یہ ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ میں کاروباری آدمی ہوں' عموماً میں صبح آٹھ یا نو بجے گھر سے نکلتا ہوں اور عام طور پر رات ہی کو گھر جاتا ہوں۔ دن کے وقت باہر ہی کہیں ہوٹل وغیرہ پر کھانا کھا لیا کرتا ہوں اور گھر نہیں جاتا۔ کچھ عرصہ قبل سردیوں کے موسم میں دن کے وقت مجھے کاروباری مصروفیت کے سلسلے میں اپنے گھر کے پاس جانا پڑا' چونکہ گھر کے نزدیک آیا تھا اس لیے دل میں خیال آیا کہ ذرا گھر کا بھی ایک چکر لگا لینا چاہیے۔ گھر پہنچا تو دیکھا کہ میری بھانجی اپنے ایک سال کے بچے کے ساتھ گھر آئی ہوئی ہے۔ میں نے بھانجی سے خیر خیریت دریافت کی تو والدہ صاحبہ نے سوال کر دیا کہ بیٹا کیوں آئے ہو۔ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ غلطی ہو گئی۔ بہر حال بعد میں انہیں سنجیدگی سے بتایا کہ کچھ کام تھا۔ گھر کے نزدیک آیا تھا اس لیے سوچا چلو گھر سے بھی ہوتے چلیں۔

وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آیا تو بیوی نے بھی یہی سوال کر دیا کہ کیوں آئے ہو تو میں نے طنزاً یہی جواب دیا کہ غلطی ہو گئی۔ ابھی میں چارپائی پر بیٹھا ہی تھا

کہ باہر سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا تو صحن میں میری بھانجی بری طرح رو رہی تھی' میں دوڑتا ہوا اپنی بھانجی کے پاس گیا اور بھی گھر والے دوڑ کر اس کے قریب آئے تو اس نے بتایا کہ میں نے اپنے بچے نوید کو پیشاب کرنے کے لیے بٹھایا اور ذرا سی اس سے دور ہوئی تھی کہ وہ کنویں کے تھڑے پر چڑھ کر کنویں میں گر گیا ہے۔ یہ کنواں ہم نے تھوڑے ہی عرصے پہلے کھدوایا تھا اس کنویں میں پانی اچھا خاصا ہوتا ہے۔ حالانکہ گرمیوں میں گھر کے اردگرد کے بہت سے کنویں خشک ہو جاتے ہیں مگر اس کنویں پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ابھی کنواں اوپر تک پختہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ لکڑی کی بلیاں وغیرہ سے چھت سی بنا کر درمیان میں تین ضرب تین فٹ کی جگہ چھوڑ دی تھی۔ اس کے دونوں طرف اینٹوں کے پائے اس چھت کے اوپر کھڑے کر کے سریا اور گراری لگا کر وہاں سے ڈول کے ذریعہ پانی نکالا جاتا تھا۔

یہ کنواں کم از کم پچاس فٹ گہرا تھا' میں نے اپنے گاؤں کی ندی میں تیرنا سیکھا ہوا تھا۔ فوج میں بھی کچھ عرصہ گزارا تھا اور ایسے چیلنج کا مقابلہ کرنا میری تربیت میں شامل تھا۔ میں نے فوراً کہا کہ ڈول کی رسی کو تھامو۔ اتنے میں والد صاحب گھر کے اندر سے رسہ نکال کر لے آئے۔ میں نے انہیں رسہ تھامنے کے لیے کہا اور رسے کا ایک سرا پکڑ کر کنویں میں لٹک گیا اور اوپر والوں کو آواز دی کہ جلدی جلدی رسہ چھوڑتے جاؤ' ایک ایک لمحہ قیمتی تھا مگر رسہ بہت آہستہ آہستہ نیچے آ رہا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ رسہ صحیح طرح سے کھلا نہیں تھا اور اس میں گرہیں پڑ گئی تھیں۔ میری بڑی بہن کا ہاتھ بھی رسے میں پھنس کر زخمی ہو گیا تھا۔ الجھے رسے کو کھولنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ میں نے نیچے دیکھا تو بچہ پانی میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ رسہ چھوڑا نہیں جا رہا تھا۔ پھر جب میں پانی کی سطح سے تقریباً پندرہ فٹ کی اونچائی پر تھا تو میں نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

جیسے ہی میں نے رسہ چھوڑا اوپر کے تمام لوگ جنہوں نے رسے کو کھینچ رکھا تھا پیچھے کی طرف گرے، گھر کے تمام افراد آہ وزاری کرنے لگے کہ ایک تو گیا تھا دوسرا بھی ہاتھ سے گیا۔ کیونکہ رسہ بہت آہستہ نیچے آرہا تھا اس لیے مجھے مجبوراً یہ کرنا پڑا تھا۔ اتنی اوپر سے چھلانگ لگانے کے باوجود میرے پاؤں نے پانی کے نیچے کی زمین کی تہہ کو نہیں چھوا تھا' جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کنویں میں کتنا پانی ہوگا۔ بہرحال میں نے ادھرادھر ہاتھ گھمایا تو بچے کا لباس میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں اسے لباس سے پکڑ کراوپر سطح پر لے آیا۔ پھر بچے کو پکڑ کر اینٹوں کی منڈیر پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ بچہ بے ہوش تھا' ظاہر ہے کہ اوپر سے گرنے کے بعد بچے نے رونے کی کوشش کی ہوگی مگر پانی کے اندر نہ رویا جاسکتا ہے اور نہ ماں کو پکارا جاسکتا ہے اور نہ ہی سانس لی جاسکتی ہے کیونکہ اس طرح کرنے سے ناک اور منہ کے ذریعے آدمی کے جسم میں پانی داخل ہو جاتا ہے۔ بچے نے ایسا کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ پانی نے اسے بھی معاف نہیں کیا۔

بچے کے جسم کے اندر جتنی گنجائش تھی وہ پانی پی چکا تھا اور اب موت کی وادی میں داخل ہونے ہی والا تھا۔ میں نے بچے کو پیٹ کے بل بازو پر لٹایا' پیٹ کے نیچے بازو رکھنے سے پیٹ پر دباؤ پڑا' بچے کو الٹی ہوئی اور اس کے پیٹ سے پانی خارج ہو گیا۔ پانی خارج ہوتے ہی بچہ ہوش میں آگیا اور رونے چیخنے لگا۔ بچے کی آواز اوپر پہنچی تو اوپر والوں کو کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے اوپر دیکھا تو لکڑیوں سے بنی ہوئی خستہ سی چھت مجھے نظر آئی۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ چھت جس پر اینٹوں کے پائے بنے ہوئے ہیں گر جائے تو پھر کیا ہو۔ یہ سوچتے ہی خوف کی ایک لہر آئی اور میرے دل پر چھا گئی۔

مگر پھر میں نے قوت ارادی سے خود ہی اپنے دل کو حوصلہ دیا کہ اپنے آپ کو

نہ سنبھالا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میں خود ہی بے ہوش ہو کر پانی میں گر جاؤں۔ بہرحال اوپر والوں نے رسے کے ساتھ ایک ٹوکرا باندھ کر بھیجا کہ پہلے اس بچے کو اس میں بٹھاؤ تاکہ اسے پہلے نکال لیں مگر بچہ میرے ساتھ اور زور سے لپٹ گیا اور چیخنے چلانے لگا۔ وہ کسی بھی قیمت پر مجھ سے علیحدہ ہونے کو تیار نہیں تھا' چنانچہ انہوں نے ٹوکرا اوپر کھینچ لیا اور لکڑی کی ایک موٹی سی پھٹی باندھ کر نیچے بھیجی۔ میں پھٹی پر بیٹھ گیا اور بچے کو اپنی بغل میں دبا لیا اور آہستہ آہستہ ہم کو اوپر کھینچ لیا گیا۔ ہم موت کے منہ سے باہر آئے تو سب ہی نے خوشی اور اطمینان کا سانس لیا' بچہ روتا ہوا ماں کے ساتھ لپٹ گیا اور اس دوران کافی تعداد میں محلے کے مرد و خواتین جمع ہو چکے تھے' سب ہی گھر کے لوگوں کو مبارکباد دے رہے تھے اور میں بھی خوش تھا کہ بچے کو بچا کر بھانجی اور اس کے سسرال کے آگے میں سرخرو ہو گیا تھا ورنہ وہ ان کو کیا جواب دیتی کہ مہمان بن کر گئی تھی اور بچہ گنوا آئی ہوں۔ محلے کی عورتیں آپس میں کہہ رہی تھیں کہ میں نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور میری بھانجی کہہ رہی تھی کہ میرا ماموں تھا جس نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر کنویں میں چھلانگ لگا دی اور میرے بچے کو موت کے منہ سے نکال لایا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس میں صرف خدا کی رضا شامل تھی' خدا نے یہ معجزہ دکھانا تھا جو عین وقت پر میں خلاف معمول گھر پہنچا تھا ورنہ میں کیا اور میری مجال کیا۔

ختم شد

بھوتوں کی ٹرین

زندگی میں کچھ نہ کچھ واقعات بہت عجیب ہوتے ہیں جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ ایسی طاقتوں کا وجود ضرور ہے جو انسان کو کسی موڑ پر تنگ کرتی ہیں' نقصان بھی پہنچا سکتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے میں آج تک سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میں میڈیکل کا طالب علم ہوں اور تعلیم کے سلسلے میں اپنے گھر سے دور ایک کالج میں زیر تعلیم ہوں۔ مجھے داخلہ لئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ گھر سے تار موصول ہوا کہ فلاں رشتے دار کے ہاں شادی ہے تمہارا جانا ضروری ہے چنانچہ ہاسٹل سے جلد از جلد اس شہر پہنچو۔ میں نے بڑی مشکل سے چھٹی کی درخواست منظور کرائی اور سامان باندھ کر ریلوے اسٹیشن چل پڑا۔ جب میں اسٹیشن پہنچا تو کافی رات ہو چکی تھی وہاں ایک عجیب سا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ بکنگ آفس تک گیا' لیکن وہاں بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ کچھ دیر رک کر انتظار کر لیتا ہوں کیا پتہ بکنگ کلرک کسی کام سے اپنی سیٹ سے اٹھا ہو۔

دو منٹ دس منٹ بیس منٹ گزر گئے لیکن بکنگ کلرک کا کہیں پتہ نہیں تھا' حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس وقت یہاں اسٹیشن پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال میں انتظار

کرنے لگا۔ پھر اچانک ریل کی پٹریوں پر کچھ تحریک سی ہوئی اور پھر دور سے ایک ٹرین پلیٹ فارم کی طرف آتی ہوئی نظر آئی۔ دل میں اچانک خیال آیا کہ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹرین کتنی دیر رکتی ہو گی' یہ کیوں نہ کروں کہ ٹرین میں چڑھ جاتا ہوں ٹکٹ راستے میں بنوا لوں گا۔ یہ خیال آتے ہی میں جلدی سے ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ میرے سامان میں میرا ایک بیگ تھا جس میں میرے چند جوڑے کپڑے تھے۔ یہ بیگ میرے کندھے سے لٹکا ہوا تھا۔ بہرحال میں ڈبے کے اندر پہنچ گیا تھا۔

ڈبے کے نیم تاریک ماحول میں مجھے ایک مرد ایک عورت اور ایک بچہ نظر آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر مرد نے برا سا منہ بنایا تھا جبکہ عورت جو سویٹر بننے میں مصروف تھی' ہاتھ روک کر مجھے دلچسپی سے دیکھنے لگی تھی۔ میں نے مرد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ کی اجازت ہو تو.....'' مرد نے بڑی ناگواری سے سر ہلا دیا تھا جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میں ان کے درمیان بے وقت دخل انداز ہوا ہوں اور بادل نخواستہ مجھے یہاں بیٹھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مرد نے ایک اخبار نکال کر منہ کے سامنے کر لیا اور اسے پڑھنے کی ناکام کوشش کرنے لگا جبکہ عورت دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ابھی مجھے بیٹھے ہوئے دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ٹرین اچانک چل پڑی اور مجھے شدید جھٹکا لگا۔ ٹرین ایک دم ہی پوری اسپیڈ کے ساتھ دوڑنے لگی تھی۔ عام حالات میں اتنی اچانک اتنی تیز رفتاری سے ٹرین کا چلنا ایک حیران کن بات ہی ہے۔ میں شدید حیرانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جبکہ مرد' عورت اور بچہ بالکل اطمینان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چیزیں بھی اپنی جگہ ساکن تھیں۔ بہرحال میں بھی اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھا رہا۔ پھر بچے نے اپنے سامان میں سے ایک گیند نکالی اور اس سے کھیلنے لگا۔ ماں نے ایک بار پھر ہاتھ روک

کر بچے کی طرف دیکھا اور بولی۔

''شانی شانی بیٹا رکھ دو اسے۔''

''کھیلنے دو' کوئی بات نہیں۔'' مرد نے کہا اور عورت خاموش ہو گئی۔ میری آنکھوں میں نیند کے ڈورے تیرنے لگے تھے۔ اور پھر وہ بند ہونے لگیں۔ لیکن اچانک مجھے آنکھیں کھولنا پڑی تھیں۔ نیم وا آنکھوں سے میں اس بچے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا' بچہ مسلسل گیند سے کھیل رہا تھا کہ اچانک گیند کھڑکی سے باہر چلی گئی جسے بچے نے ہاتھ بڑھا کر لپک لیا تھا۔ خدا کی پناہ' خدا کی پناہ' کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ بچے کا ہاتھ اتنا لمبا ہو جائے کیا ایک چھوٹے سے بچے کا ہاتھ اتنا لمبا ہو سکتا ہے۔ میری تو گھگھی سی بندھ گئی تھی اور میں اب پوری آنکھیں کھول کر بیٹھا ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد جو ہوا وہ میرے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ اس بار گیند مرد کی طرف والی کھڑکی سے باہر نکل گئی تھی جسے مرد نے بھی ہاتھ لمبا کر کے پکڑ لیا تھا۔ مارے خوف کے میری آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ اتنا اندازہ تو ضرور ہو گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ میں نے ہمت کر کے ان سے بات کرنے کی کوشش کی۔

''کک...... کیا کیا آپ نے ہاتھ لمبا کر کے گیند باہر سے پکڑی ہے۔'' تینوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا تھا' پھر آدمی نے کہا۔

''ہاں ہاں میں نے اس طرح پکڑی تھی یہ گیند'' مرد کا ہاتھ انتہائی حد تک لمبا ہو گیا تھا۔ اور میری چیخیں نکلنے لگی تھیں۔ پھر ایک اور عجیب منظر رونما ہوا۔ اچانک ہی چلتی ہوئی ٹرین کا یہ ڈبہ باسکٹ بال کا میدان بن گیا تھا۔ گیند کا حجم باسکٹ بال کی گیند کے برابر ہو گیا تھا۔ ڈبے میں ایک جانب باسکٹ نمودار ہو گئی تھی۔ اور اب مرد عورت اور بچہ اپنی اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے تھے اور پھر انہوں نے باسکٹ بال کے کھلاڑیوں کی طرح پوز بنایا اور پھر ایک عجیب و غریب کھیل کا آغاز ہو گیا۔ وہ تینوں

ڈبے میں باسکٹ بال کھیل رہے تھے' وہ میرے اندر سے آر پار گزر رہے تھے۔ ان کا وجود دھوئیں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ وہ خوب شور مچا مچا کر ایک دوسرے سے بال چھین رہے تھے۔ ہاتھ لمبے کر کے ایک دوسرے کو ڈاج دے رہے تھے اور باسکٹ میں گول کئے جا رہے تھے اور یہ سارا منظر میرا بوریا بستر گول کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں شدید خوف اور پریشانی کے عالم میں ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا' مجھ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی' چیخ چیخ کر حلق میں تکلیف ہونے لگی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ عقل اس بات کو تسلیم کرنے سے قاصر تھی کہ اچانک ایک ٹرین کا ڈبہ باسکٹ بال کا میدان کیسے بن گیا۔ میں شدید خوف اور دہشت کے عالم میں چیخا۔

''تت...... تم لوگ...... تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو' کیا ہے یہ سب؟'' اچانک ان تینوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر مرد نے مجھ سے کہا۔

''چپ چاپ بیٹھ جاؤ' ہمارے کھیل کو ڈسٹرب نہ کرو۔''

''مم...... میں میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے۔''

''بکواس بند کرو اور سیدھے بیٹھے رہو۔''

''کیسے بیٹھوں سیدھے۔'' میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ مرد نے ایک لمحے کے لیے عورت کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

''بہت ڈسٹرب کر رہا ہے یہ' ہمارا وقت برباد ہو رہا ہے' کھیل میں بھی مزہ نہیں آ رہا' آؤ پہلے اس کا بندوبست کریں۔'' وہ تینوں میری طرف بڑھے تھے اور پھر مرد نے میرے دونوں ہاتھ پکڑے جبکہ عورت اور بچے نے ایک ایک ٹانگ پکڑی اور اس کے بعد مجھے ڈنڈا ڈولی کرنے لگے' میں ایک بار پھر پوری قوت سے چیخنے لگا تھا۔ ڈنڈا ڈولی کر کے انہوں نے مجھے ایک جانب اچھال دیا تھا۔

بڑی زور سے گرا تھا' ہاتھ اور پیروں میں گھسٹ لگی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کسی بہت زیادہ کھردری یا پتھریلی زمین پر نہیں گرا۔ آنکھیں مضبوطی سے بھینچی ہوئی تھیں۔ پھر تین چار منٹ تک اسی طرح پڑا رہا تھا۔ اس کے بعد آنکھیں کھولیں تو ایک بار پھر مجھ پر حیرانی کا دورہ پڑا تھا۔ میرا وجود پلیٹ فارم کی زمین پر پڑا ہوا تھا اور سامنے ہلکی سی روشنی میں اسی ریلوے اسٹیشن کی تختی نظر آرہی تھی جہاں سے میں نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

ہاتھوں اور پیروں پر گھسٹ لگی تھی' چہرہ وغیرہ بچ گیا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھا' کپڑے جھاڑے' حلیہ درست کیا' اور پھر پلیٹ فارم کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ وہی رات کا وقت تھا اور ماحول پر وہی خاموشی طاری تھی۔ اندر پہنچ کر بکنگ آفس کے سامنے سے گزرا کہ بکنگ کلرک نظر آیا' میں بے اختیار اس طرف لپکا۔ میں نے بکنگ کلرک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بھائی! مجھے ٹرینوں کا شیڈول پتہ چل سکتا ہے۔ آپ نے کوئی بورڈ وغیرہ بھی نہیں لگایا ہوا' جبکہ ہر اسٹیشن پر شیڈول بورڈ ہونا چاہیے۔'' بکنگ کلرک نے حیرانی سے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر بولا۔

''جناب بس آپ جیسے کچھ لوگوں کی مہربانی ہے' لیکن آپ اس وقت۔''

''جی مجھے ابھی یہاں سے نکلنا ہے' پلیز مجھے شیڈول بتایئے۔'' بکنگ کلرک نے مجھے ٹرینوں کا شیڈول بتاتے ہوئے کہا۔

''جناب شیڈول کے مطابق رات کو اس وقت اس اسٹیشن سے کوئی ٹرین نہیں گزرتی۔''

''جی''۔ میں نے حیرانی سے کہا۔

''جی ہاں' آپ صبح گیارہ بجے سے پہلے یہاں سے روانہ نہیں ہو سکتے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا......؟''

''بھائی میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ رات کی کوئی ٹرین نہیں ہے۔ ہاں چار سال پہلے ایک ٹرین ضرور چلی تھی جو رات میں یہاں پر رکتی تھی' لیکن پھر اس اسٹیشن سے تھوڑے فاصلے پر دہشت گردی کے نتیجے میں ایک انجن بوگیوں سمیت تباہ ہو گیا۔ پوری ٹرین تباہ ہو گئی' بڑے لوگ مرے تھے ...... بس اس واقعے کے بعد کوئی ٹرین رات میں یہاں نہیں رکتی ...... بکنگ کلرک اپنی کہہ رہا تھا اور میں خوف کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ واقعی یہ اصلی ٹرین نہیں تھی بلکہ بھوتوں کی ٹرین تھی۔ اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اوہ مائی گاڈ۔ اوہ مائی گاڈ۔ اوہ مائی گاڈ۔''

ختم شد

اُڑن طشتری

میرا نام دانش ہے اور میں ایک گورنمنٹ ادارے میں سول انجینئر کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ یہ آج سے کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے کہ میری پوسٹنگ سکھر میں ہوئی۔ چھڑا چھانٹ تھا' گھر والوں کی طرف سے بھی کوئی پریشانی نہیں تھی' چنانچہ میں سکھر کے لیے روانہ ہوگیا۔ سکھر پہنچ کر ریلوے اسٹیشن پر میری ملاقات وہاں کے سائٹ انجینئر ناصر سے ہوئی۔ سادہ طبیعت کا ہنس مکھ بندہ تھا' وہ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ پھر وہ اپنی جیپ میں مجھے ریسٹ ہاؤس لے گیا' ریسٹ ہاؤس اچھا خاصا بڑا تھا وہاں ایک نوکر میری خدمت کے لیے مامور تھا۔ باتوں کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ ناصر وہاں کا مقامی رہائشی ہے اور اپنی ماں اور بہن کے ساتھ رہتا ہے۔ پھر اس نے کہا آج میں آرام کروں اور وہ مجھے کل سائٹ پر لے جائے گا۔

بہرحال ناصر کے ساتھ باتیں ہوتی رہیں۔ خاصا وقت گزر گیا۔ پھر دوپہر کا کھانا وغیرہ کھایا اور اس کے بعد ناصر مجھ سے رخصت ہوگیا۔ میں بھی آرام کرنے لیٹ گیا تھا' سفر کے دوران کافی تھک گیا تھا اس لیے نیند آ گئی۔ پھر شام کو کافی دیر میں آنکھ کھلی تھی' کپڑے چینج کر کے کمرے سے باہر نکلا اور ریسٹ ہاؤس کے باہر

والے حصے میں نکل آیا۔ باہر ناصر موجود تھا۔ میں نے ناصر کے ساتھ چائے وغیرہ پی' پھر ناصر مجھے لے کر گھومنے نکل گیا۔ یہاں اس نے مجھے کئی جگہیں دکھائیں اور پھر جب ہم واپس ریسٹ ہاؤس پہنچے تو رات کے کھانے کا وقت ہوگیا تھا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ناصر مجھ سے رخصت ہوگیا۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ کپڑے وغیرہ بدل کر کافی دیر تک ٹی وی دیکھتا رہا تھا' ملازم اپنے کوارٹر میں سونے چلا گیا تھا۔ پھر ٹی وی بند کر کے باہر نکل آیا' نیند نہیں آ رہی تھی' بڑی فریش طبیعت ہو رہی تھی۔ کمرے سے باہر نکلا اور ریسٹ ہاؤس کے باہر والے حصے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت اچانک ایک عجیب واقعہ ہوا۔ آسمان پر بجلی سی کوندی تھی اور ایک عجیب سی چیز تیزی سے گزر گئی۔ فلموں میں اڑن طشتری دیکھی تھی۔ کئی دفعہ افواہیں بھی سنی تھیں' لیکن یہ کیا تھا' کیا تھا یہ سب' میری عقل کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کافی دیر تک وہیں بیٹھا اس بارے میں سوچتا رہا کہ ایسا کیسے ممکن ہوسکتا ہے' کسی کو بتاتا تو لوگ ہنستے کہ عجیب وہمی شخص ہے۔ بہرحال اپنے کمرے میں آ گیا تھا اور پھر بستر پر لیٹ کر کافی دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا تھا۔ پھر سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی تھی۔

دوسری صبح اٹھا تو طبیعت کافی تروتازہ تھی۔ نہا دھو کر لباس تبدیل کیا اور باہر نکلا تو ناصر ناشتے کی ٹیبل پر میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''بس سر جلدی سے ناشتہ کریں' میں آپ کے ساتھ چائے پیوں گا اور پھر ہم چلیں گے۔''

''کیوں۔ ناشتہ نہیں کرو گے؟''

''ناشتہ کر کے آیا تھا' لیکن چائے کی پیالی آپ کے ساتھ پینے کا ارادہ تھا۔''

''ضرور ضرور۔'' پھر میں نے ناشتہ کیا' ناصر اس دوران مجھے کام کی تھوڑی بہت تفصیلات سمجھاتا رہا تھا۔ پھر ہم سائٹ کے لیے روانہ ہوگئے۔

مجھے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا تھا۔ میرا دل کافی حد تک یہاں لگ گیا تھا' ناصر سے کافی دوستی ہوگئی تھی' باقی لوگ بھی بہت اچھے تھے۔ ہاں ایک عجیب بات یہ ہوئی تھی کہ ایک رات مجھے دوبارہ وہی عجیب چیز نظر آئی تھی۔ کبھی سوچتا کہ ناصر سے کہوں' لیکن پھر دل میں خیال آتا کہ نجانے وہ میرے بارے میں کیا سوچے۔ چنانچہ خاموشی ہی بہتر تھی۔ پھر ایک مہینہ گزر گیا' اس ایک مہینے میں وہ چیز مجھے آٹھ دس مرتبہ نظر آئی تھی' نجانے کیوں میں راتوں کو جاگ کر اس کی کھوج میں لگا رہتا اور سوچتا کہ یہ ہے کیا بلا' کیا یہ مجھے ہی نظر آتی ہے کیونکہ کسی اور نے بھی کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی کہیں سے کوئی خبر سننے کو ملی تھی۔ بہرحال اب یہ کوئی اتنی پریشان کن چیز بھی نہیں تھی کہ ہر وقت اس کے بارے میں سوچتا رہوں' لیکن پھر ایک دن ناصر نے ایک دھماکہ کر دیا تھا۔

''سر آج میں آپ کو ایک اہم بات بتانا چاہتا ہوں۔'' اس کے اس انداز پر میں چونکا تھا۔

''کیا اہم بات؟''

''سر یہ سب' یہ کنسٹرکشن میری فیلڈ نہیں ہے' حالانکہ میں سول انجینئر ہوں لیکن صرف والد صاحب کی ضد کی وجہ سے' میرا رجحان شروع ہی سے ٹیلی کمیونیکیشنز کی طرف رہا ہے اور سر میں رات کے فارغ وقت میں ایک پراجیکٹ پر کام کر رہا تھا اور میں نے ایک ایسی چیز ایجاد کر لی ہے جو پوری دنیا میں تہلکہ مچا سکتی ہے۔'' اس کے اس جوش و خروش سے میں حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ پھر میں نے کہا۔

''ناصر خود کو سنبھالو اور اور یہ بتاؤ کہ کیا تم' کیا تم مجھے اپنی وہ ایجاد دکھا سکتے ہو۔''

''جی سر بالکل' اس کے لیے آپ کو میرے ساتھ ایک جگہ چلنا ہوگا۔''

''تو چلو دیر کس بات کی ہے؟'' اور ہم لوگ اپنی جگہ سے اٹھ گئے' جیپ ناصر کے پاس تھی' پہلے وہ اپنے گھر گیا' میں جیپ کے اندر بیٹھا رہا تھا' وہ ایک منٹ میں واپس آ گیا تھا اور پھر جیپ اسٹارٹ کر کے چل پڑا تھا۔ پھر کافی دیر تک سفر کرنے کے بعد جیپ شہر سے نکل کر ایک غیر آباد علاقے میں داخل ہوگئی تھی۔ پھر ناصر نے ایک کھلے میدان میں جیپ روک دی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''آیئے سر۔'' اور میں خاموشی سے اتر کر اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ تھوڑا سا آگے جا کر اس نے جیپ کی' کی چین کے ساتھ لگے ہوئے ریموٹ کنٹرول کے کچھ بٹن دبائے اور سامنے موجود زمین کا ایک حصہ اوپر اٹھنے لگا۔ پھر اس جگہ زمین سے ایک ایسی چیز نمودار ہوئی تھی جسے دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ میرے منہ سے اچانک نکلا۔

''خدا کی پناہ خدا کی پناہ یہ تو وہی اڑن طشتری ہے جس نے میری راتوں کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔'' جواب میں ناصر نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں سر یہ اڑن طشتری نہیں' یہ جدید سائنس کی ایک حیرت انگیز ایجاد ہے' یہ سیٹلائٹ کیچر ہے' میں اس کے ذریعے دنیا کے کسی بھی سیٹلائٹ سے ہونے والی کارروائی معلوم کر سکتا ہوں' اس کے ذریعے میں فضا میں ایک مخصوص حد تک اوپر پہنچ سکتا ہوں اور وہاں سے انفارمیشن لے سکتا ہوں۔ اس میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ ساؤنڈ پروف ہے' اب میں آپ کو اس کا ڈیمو دکھاتا ہوں۔''

پھر ناصر اس طشتری میں لگی ہوئی سیٹ پر بیٹھ گیا' اس نے سر پر ہیلمٹ پہنا اور پھر مشین پر لگے ہوئے ریموٹ سے اسے آپریٹ کرنے لگا' پھر ناصر نے مجھے تھوڑا سا دور ہٹ جانے کے لیے کہا اور میں دور ہٹ گیا۔ پھر اس نے مجھے او کے سگنل دیا' شیشے کا ڈور بند کیا اور پھر اچانک زن کی آواز کے ساتھ وہ مشین پوری قوت سے فضا

میں اچھل گئی۔ بالکل ایسا لگا تھا جیسے فٹ بال کو کک لگا کر فضا میں اچھال دیا گیا ہو۔ وہ بے آواز مشین مسلسل اوپر اٹھ رہی تھی' نجانے کس سسٹم کے تحت اسے اتنی قوت سے اچھالا گیا تھا۔ بہرحال میں حیران و پریشان کھڑا تھا۔ ایک مخصوص بلندی تک پہنچنے کے بعد وہ طشتری انتہائی تیزی سے دائیں جانب سفر کرنے لگی اور پھر غائب ہوگئی۔

سب کچھ ایک خواب لگ رہا تھا۔ جیسے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو' اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ مجھے راتوں کو نظر آنے والی اڑن طشتری یہی مشین تھی اور اس کا موجد' اس کا موجد میرا دوست تھا' خدا کی پناہ' خدا کی پناہ' یہ تو قیامت مچا دے گا۔ حیران و پریشان اسی جگہ کھڑا رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اچانک آسمان پر وہ طشتری نمودار ہوئی۔ اور پھر اتنی ہی تیزی سے زمین کا سفر کرنے لگی۔ زمین پر اترنے کے بعد ناصر نے مشین آف کی' پھر اسی میکنزم کے تحت مشین زمین میں چلی گئی اور ناصر میرے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ اور جب اس نے وہ کاغذات میرے سامنے کیے تو ایک بار پھر میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔

ایک انجینئر ہونے کے ناطے اتنا تو مجھے بھی اندازہ تھا کہ وہ ضرور کسی حساس علاقے کی تصویریں تھیں۔ بہرحال میں نے ناصر کو مبارکباد دی تھی۔ پھر یہ غالباً اس واقعے کے تیسرے دن کی بات ہے جب ہمارا پروجیکٹ مکمل ہو گیا تھا۔ چوتھے دن مجھے اپنے آفس رپورٹ کرنا تھی۔ میں نے ناصر کو مبارکباد دی تھی اور کہا کہ وہ جلد از جلد اعلیٰ حکام سے رابطہ کرے اور پھر مجھے اس کی رپورٹ دے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سب سے پہلے مجھے خوش خبری سنائے گا۔ پھر میں واپس اپنے شہر چل پڑا۔ اپنے آفس رپورٹ کی۔ اس کے بعد روزمرہ کے معمولات جاری ہو گئے۔ ناصر سے فون پر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔

پھر ایک دن ناصر نے بتایا کہ اس نے بھرپور کوشش کر لی ہے' لیکن کہیں سے

کوئی رسپانس نہیں مل رہا اور وہ دلبرداشتہ ہو کر ملک سے باہر جا رہا ہے۔ پھر وہ ملک سے باہر چلا گیا اور میرے لیے یہ سوچ چھوڑ گیا کہ کب تک ایسے نوجوان اپنی صلاحیتیں دوسرے ملکوں کے لیے استعمال کرتے رہیں گے اور ہمارا ملک ان سے محروم رہے گا۔ کافی دن تک ناصر کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلا۔ سارے خیالات میرے ذہن سے نکل گئے لیکن پھر ایک دن اچانک ناصر مجھے دوبارہ مل گیا۔ شاندار سوٹ میں ملبوس تھا اور بہت خوشحال نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے امریکی خلائی ادارے ناسا میں شاندار عہدہ مل گیا ہے اور وہ اپنی امی اور بہن کو لینے آیا ہے۔

ختم شد

فیصلہ

بہت سے لوگ یہ بات جانتے تھے کہ جوادعلی ہی حسن شاہ کا قاتل ہے۔ لیکن بس ایک ذرا سی الجھن تھی وہ یہ کہ حسن شاہ کی لاش کسی بھی طور پر دستیاب نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں تھی' اصل میں جو گواہان حسن شاہ اور جوادعلی کے درمیانی مسئلے کو جانتے تھے انہوں نے پورے وثوق سے شہادتیں دی تھیں اور بتایا تھا کہ جوادعلی ہر قیمت پر حسن شاہ کو قتل کر دینا چاہتا تھا اور اس کی وجہ ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی جس کا نام رحمانہ جلیل تھا۔ جوادعلی کے اس سے بہت قریبی تعلقات تھے اور عین ممکن تھا کہ دونوں شادی کر لیں' لیکن حسن شاہ درمیان میں ٹپک پڑا۔

حسن شاہ ایک بہت ہی خوبصورت اور توانا نوجوان تھا' اس میں ایک مقناطیسی قوت تھی چنانچہ رحمانہ جلیل اس کی جانب کھنچتی چلی گئی۔ جوادعلی نے اسے بہت سمجھایا کہ حسن شاہ ایک فلرٹ اور اوباش آدمی ہے' لیکن رحمانہ جلیل بالکل تبدیل ہو گئی تھی' حسد اور رقابت نے جوادعلی کو دیوانہ کر دیا دو تین بار اس نے حسن شاہ کو اپنے دوستوں کے سامنے وارننگ دی کہ وہ راستے سے ہٹ جائے' لیکن حسن شاہ باز نہیں آیا اور پھر اچانک ہی ایک رات وہ غائب ہو گیا' کچھ لوگوں نے اس کے چیخنے چلانے کی

آوازیں سنی تھیں اور اس کے بعد حسن شاہ کہیں سے نہیں آسکا تھا' اس کی بہن نے مقدمہ قائم کر دیا تھا اور اپنے بھائی کے قتل کے شبہے کا اظہار کرتے ہوئے جوادعلی پر شبہ ظاہر کیا تھا۔

مقدمہ چل رہا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جوادعلی نے اپنا کیس شہر کے سب سے نامور وکیل عدیل ہاشمی کو دیا تھا' عدیل ہاشمی کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ قانون کا جادوگر ہے اور ایسے نکتے تلاش کر کے لاتا ہے کہ عدالتیں اپنے فیصلے بدل دیں لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس بار عدیل ہاشمی عدالت کو قائل نہیں کر سکا تھا' گواہ مضبوط تھے' اور سارا مسئلہ روز روشن کی طرح عیاں۔ جج نے ارکان جیوری کو مخاطب کر کے کہا۔

''آپ حضرات ملزم کی تائید اور اس کے خلاف گواہوں کے بیانات سن چکے ہیں اور ساری شہادتیں آپ لوگوں کے سامنے پیش ہو چکی ہیں۔ اب ایک انسانی زندگی کا دارومدار آپ کے ہاتھوں میں ہے' آپ کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ملزم کی بے گناہی کا آپ کو ذرا بھی خیال ہو تو آپ اسے مجرم قرار نہیں دے سکیں گے۔''

جیوری کے ارکان فیصلہ کرنے کے لیے جیوری روم میں چلے گئے تھے' لیکن عدیل ہاشمی اپنے منصوبوں کو آخری خیال دے رہا تھا اور اس کے سینے میں جذبات کا ایک طوفان مچل رہا تھا' آخرکار جیوری کے ارکان واپس آ گئے تو عدیل ہاشمی نے کہا۔

''جناب والا! میں اجازت چاہوں گا کہ مجھے ایک اہم پہلو اجاگر کرنے کا موقع دیا جائے۔''

''معزز وکیل! دونوں طرف کی شہادتیں پیش ہو چکی ہیں' اب صرف جیوری کے ارکان کو اپنا فیصلہ سنانا ہے' پھر بھی میں آپ کو اجازت دیتا ہوں۔''

''شکریہ جناب عالی! یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ مقتول کی لاش دستیاب نہیں

ہو سکی ہے' بے شک اس کے قتل کی تصدیق کے لیے بہت سے گواہ پیش ہوئے ہیں' مگر ہمارے پاس قتل کا قطعی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میں اس وقت آپ حضرات کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس شخص کے قتل کا معاملہ یہاں درپیش ہے' وہ ابھی یہاں آنے والا ہے' اور کچھ ہی لمحوں کے بعد میرے مؤکل کی بیگناہی ثابت ہو جائے گی' وہ شخص جس کے قتل کے الزام میں اسے سزا سنائی جانے والی ہے' اگر زندہ ہو کر سامنے آ جائے تب بھی کیا آپ میرے مؤکل کو ملزم قرار دیں گے۔''

عدالت میں سنسنی دوڑ گئی' جج صاحب نے سوال کیا۔ ''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ شخص آنے والا ہے؟''

''بس دس منٹ جناب صرف دس منٹ۔ میرے آدمی اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور وہ خود بھی یہاں آنے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔'' وکیل نے کہا اور دروازے کی طرف نگاہیں جما دیں' عدالت میں موجود ہر شخص دروازے پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا' دروازہ کٹہرے کی پشت پر کھلتا تھا اور جواد علی اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے بیٹھا ہوا تھا۔ ایک گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور گھڑی کی ٹک ٹک کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک منٹ دو منٹ چار' سات اور آخر دس منٹ گزر گئے' مگر کسی کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ وکیل کے لبوں پر ایک فاتحانہ ہنسی رینگ گئی' اس نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ارکان جیوری اور معزز جج صاحب! اس وقت کمرہ عدالت میں موجود ہر شخص کی نگاہیں دروازے کی طرف تھیں کیونکہ آپ اس شخص کی آمد کے متوقع تھے جس کے قتل کے الزام میں میرے مؤکل کو سزائے موت دی جا رہی ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی موت واقع ہونے پر آپ کو بھی کوئی شک تھا اور جب کسی شخص کی موت کا یقین نہ ہو تو آپ ایک معصوم ملزم کو مجرم قرار نہیں دے سکتے۔''

عدالت میں جیسے طوفان آ گیا' تالیاں بجنے لگیں' جج صاحب کی ہتھوڑی نے خاموشی پیدا کر دی' جیوری کے ارکان دوبارہ جیوری روم میں مشورہ کرنے چلے گئے' عدیل ہاشمی کے ہونٹوں پر ایک کامیاب مسکراہٹ تھی' وکیل استغاثہ خاموش بیٹھا ہاتھ مل رہا تھا۔ دس منٹ کے بعد جیوری کے ارکان نے واپس آ کر اپنی اپنی جگہ سنبھال لی۔ جج نے پوچھا۔

''کیا فیصلہ کیا آپ لوگوں نے' آپ کی نگاہوں میں ملزم گنہگار ہے یا بے گناہ؟''

''نہیں جناب! جیسا کہ اس کے خلاف شہادتیں دی گئی ہیں' اس نے ایک جانا بوجھا قتل کیا ہے' ہم متفقہ طور پر اسے قاتل قرار دیتے ہیں۔'' عدالت میں موجود ہر شخص کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا' خود عدیل ہاشمی بھی تعجب سے جیوری کے ارکان کی شکل دیکھ رہا تھا' ان میں سے ایک ممبر نے جج کو بتایا۔

''جنہیں اس بات میں شک تھا کہ گمشدہ شخص واقعی قتل ہو چکا ہے ان کی نگاہیں اس شخص کی آمد پر لگی ہوئی تھیں' اور انہیں اس کے آنے کی توقع تھی۔ مگر ملزم جانتا تھا کہ اس نے قتل کیا ہے اور اس کے مقتول کا یہاں آنا ناممکنات میں سے ہے۔ اس لیے پوری عدالت میں ملزم ایک ایسا شخص تھا جس نے ایک بار بھی مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ اپنا منہ ہاتھوں سے چھپائے بیٹھا رہا۔

ختم شد

کوشش ناتمام

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ششدر رہ گئے۔ ہزاروں داستانیں سننے کو ملتی ہیں' جڑواں بچے ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کے ہمشکل کہ کوئی انہیں پہچان نہیں سکے۔ وہ تو خیر ایک الگ بات ہے' لیکن ان دونوں کے جڑواں ہونے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ اختر بھی اپنے ماں باپ کا اکیلا تھا اور احسن بھی' کہیں دور دور تک کوئی رشتے کا وجود نہیں تھا۔

''بھئی کمال ہے' اختر صاحب۔ میرا خیال ہے ہم لوگ خود بھی اس دلچسپ اتفاق پر یقین نہیں کر سکتے۔''

''لیکن آئینہ ہمیں یقین دلائے گا۔'' اختر نے عادت کے مطابق بجھی بجھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کیا کرتے ہیں آپ؟''

''دنیا گردی اور بس۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی...... تقدیر سے بھاگا بھاگا پھر رہا ہوں' زندگی ناکامیوں کا مجموعہ ہے'

کبھی خوشحالی نہیں دیکھی اور بدحالی ہے کہ پیچھے پیچھے دوڑ رہی ہے۔''

''ارے ارے ارے آپ کے اہل خانہ؟''

''خانہ ہی نہیں ہے اور ہم خانے کے اہل نہیں ہیں' چنانچہ اہل خانہ کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔''

''یار میری ایک بات مان لو گے۔'' احسن نے اختر سے کہا۔

''مان لیں گے...... کہو۔''

''میرے ساتھ پنڈی چلو' راولپنڈی میں میرا اپنا کاروبار ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے عالیشان مکان' یہ کار' ایک چھوٹی سی فیکٹری جس میں کوئی سولہ آدمی کام کرتے ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے بہت اچھی زندگی گزاری ہے میں نے' بچپن میں والدین کے ساتھ ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ وہیں زندگی گزاری والدین کا انتقال ہو گیا' لندن کی تنہا زندگی کو سمیٹ کر واپس اپنے وطن آ گیا اور اب یہیں رہتا ہوں۔ نہ شادی نہ بیوی بچے' زندگی ویسے غیر مطمئن تو نہیں ہے لیکن تم جیسا ایک ہمشکل ساتھی اگر مل جائے تو زندگی میں مزید دلچسپیاں پیدا ہو جائیں گی۔''

''کتنے عرصے برداشت کر سکو گے مجھے؟'' اختر نے کہا۔

''ہمیشہ ہمیشہ...... ویسے ایک بات کہوں تم سے' میرے ساتھ چلو' نہ کاروبار کی پریشانی ہو گی نہ کچھ اور...... دیکھو دوست! زندگی اور تقدیر ہر شخص کو ایک بار چانس ضرور دیتی ہے' شرط یہ ہے کہ بس اس موقعے سے فائدہ اٹھا لیا جائے۔''

اور اسی وقت اختر کے ذہن میں ایک چھناکہ سا ہوا' کیا واقعی زندگی نے اسے چانس دیا ہے' اور پھر وہ اس چانس سے پوری طرح فائدہ اٹھانے پر تیار ہو گیا۔

ایوبیہ کے ایک پراسرار گوشے میں اس نے اچانک ہی احسن پر حملہ کیا اور اس کی گردن میں رسی کا پھندا ڈال کر اس وقت تک اسے دباتا رہا جب تک کہ اس کی

روح پرواز نہ کرگئی۔ پھر اس کے بعد اس نے نہایت اطمینان سے اسے ایک کھائی میں دھکیل دیا۔ اس کا لباس اس کا ہر ساز و سامان اس نے اپنے قبضے میں کرلیا تھا' اس سے پہلے احسن سے اس کے بارے میں مکمل تفصیل معلوم کر لی تھی اس نے' اختر انتہائی چالاک آدمی تھا اور اسے یقین تھا کہ احسن کی حیثیت سے وہ ایک بھرپور زندگی گزار لے گا' تقدیر نے اسے یہ موقع دیا ہے تو اب یہ موقع اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔ کروڑ پتی بن گیا تھا وہ آن کی آن میں' احسن کا لباس وغیرہ پہن کر اس نے اس کا ڈرائیونگ لائسنس' شناختی کارڈ اور باقی جو کاغذات ملے وہ اپنے قبضے میں کر لئے اور اس کے بعد احسن کی شاندار کار میں بیٹھ کر وہ ایوبیہ سے مری اور مری سے راولپنڈی کے لیے چل پڑا۔

اس کا دل خوشی سے ناچ رہا تھا۔ ایک حسین مستقبل کے لیے اس نے ہمیشہ جدوجہد کی تھی' لیکن اس میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ آنے والے وقت کے خیال سے مسرور وہ مستی کے عالم میں ڈرائیونگ کر رہا تھا کہ اچانک ہی سامنے سے ایک ٹرک نمودار ہوا اور ایک خوفناک حادثہ ہوگیا۔ کار کا اگلا حصہ بالکل تباہ ہوگیا اور وہ شدید زخمی۔

بہرحال لوگ اسے ہسپتال لے گئے' اس کا خون بہت زیادہ ضائع ہو چکا تھا' ڈاکٹروں نے فوری طور پر اس پر کام شروع کر دیا۔ لباس وغیرہ اتار لیا گیا اور اسے خون دیا جانے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں زندگی کا چراغ بجھنے لگا۔ باقی سارے معاملات ٹھیک تھے لیکن ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ حالت اچانک ہی کیوں بگڑ گئی' خاص طور سے خون دینے کے بعد۔

پھر نجانے کیسے خیال آیا' اس کا خون ٹیسٹ کیا گیا تو پتہ چلا کہ خون اصل میں بی پازیٹو ہے' ڈرائیونگ لائسنس پر احسن کا بلڈ گروپ لکھا ہوا تھا۔ شکل وصورت اپنی

جگہ' باقی ساری باتیں بھی اپنی جگہ' لیکن بلڈ گروپ ایک نہیں تھا اور غلط خون چڑھ جانے کے باعث موت واقع ہوگئی تھی۔

تقدیر بے شک زندگی میں ایک موقع دیتی ہے' لیکن کسی کی زندگی لے کر اپنی زندگی بنانے کا تصور خدا کو پسند نہیں اور نہ ہی یہ انسانیت کا کوئی حصہ ہے۔

ختم شد

روبوٹ نمبر ایک سو اٹھائیس

زویا نے جوس کا سپ لیتے ہوئے گلاس کی اوٹ سے ایک بار پھر اس نوجوان کو دیکھا جو اس سے صرف دو میزیں آگے اسی کی جانب رخ کیے ہوئے بیٹھا تھا۔ کسی پبلک مقام پر خوبصورت لڑکیوں کو گھورنے والوں کی تعداد کم نہیں ہوتی اور اس طرح کی باتوں پر توجہ دینا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن زویا نجانے کیوں ایک عجیب سی الجھن محسوس کر رہی تھی۔ پھر وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شامل کو اس کے بارے میں بتانا چاہتی تھی کہ اچانک ہی نوجوان کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا اور پھر زویا نے اسے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا' ایک بار پھر زویا کو اپنے بدن میں سنسنی کا احساس ہوا تھا' نوجوان قریب آ کر بولا۔

''معافی چاہتا ہوں' آپ لوگوں کی تنہائی میں مداخلت ایک غیر مہذب عمل ہے لیکن کبھی کبھی مجبوریاں تہذیب سے دور لے جاتی ہیں' صرف چند منٹ آپ کے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ زویا یا شامل کوئی جواب دیں وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ زویا نے شامل کی جانب دیکھا' شامل کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں' پھر اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

''جی فرمایئے' کیا تکلیف ہے آپ کو؟''

''میں آپ دونوں کے درمیانی رشتے کو معلوم کرنا چاہتا ہوں...... محترمہ! کیا آپ بتا سکیں گی کہ ان صاحب سے آپ کا کیا تعلق ہے۔'' زویا کے بجائے شامل نے کہا۔

''کیا آپ محکمہ خفیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ کتنا بے ہودہ سوال کیا ہے آپ نے' کسی اجنبی جوڑے سے براہ راست یہ سوال کر بیٹھنا' اگر آپ کا تعلق محکمہ' پولیس سے ہے تو براہ کرم اپنا کارڈ دکھایئے۔''

''اوہو...... میرا تعلق محکمہ' پولیس سے تو نہیں ہے' البتہ یہ میرا کارڈ ہے۔'' اس نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر دیا جس پر ایک بڑا نمبر لکھا ہوا تھا۔ ''ایک سو اٹھائیس۔ ڈاکٹر زیڈ فاروقی''

دونوں کی نگاہیں کارڈ پر پڑیں' زویا تو کچھ نہ سمجھ سکی لیکن شامل کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا' اچانک ہی اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے ابھر آئے تھے' زویا نے حیرانی سے سامنے والے نوجوان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک سو اٹھائیس آپ کا نام ہے۔ کیا اس طرح کے اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں اس قسم کے مذاق کی اجازت ہوتی ہے' میرا خیال ہے یہ ایک غیر مہذب حرکت ہے اور میں آپ کو......'' تبھی اس کی نگاہ شامل پر پڑی' شامل کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا' زویا چونک پڑی پھر بولی۔

''ارے تمہیں کیا ہوا؟''

''یہ بھی مجھے ہی بتانا ہو گا' مجھے افسوس ہے کہ آپ کی تنہائی میں مخل ہوا' یہ ڈاکٹر زیڈ فاروقی ایک بہت بڑا سائنسدان ہے' اعلیٰ سرکاری حلقوں میں بڑی عزت کا مقام ہے اس کا' ملک کی مقتدر شخصیتوں میں سے ہے' بہت سے سائنسی فارمولے ایجاد کیے

ہیں اس نے اور حکومت کو بڑے فائدے پہنچائے ہیں' لیکن اس کا اپنا شوق ایک ایسا مشینی انسان بنانا تھا جس میں عام انسانوں جیسی تمام خصوصیات ہوں اور وہ عام انسانوں سے بالکل مختلف نہ ہو' اس کے اندر ہر سوچ ہو' پیار محبت نفرت عمل' دیکھنے میں وہ بالکل انسانوں جیسا ہو اور اس کاوش میں اس نے زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ صرف کر دیا۔ ایک سو چھبیس مشینی انسان بنائے اس نے اور ان پر تجربات کرتا رہا' ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خامی نکل آتی تھی' آخر اس نے ایک سو ستائیسواں روبوٹ بنایا اور اس نے محسوس کیا کہ یہ روبوٹ ہر لحاظ سے مکمل ہے' یہ اپنے طور پر سوچ سکتا تھا اور ہر کام کر سکتا تھا' ڈاکٹر زیڈ فاروقی نے اسے آزمائش کے لیے اپنی تجربے گاہ سے باہر نکال دیا اور یہ ایک عام زندگی اپنانے میں کامیاب ہو گیا' لیکن سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ ڈاکٹر زیڈ فاروقی کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ ڈاکٹر فاروقی اسے واپس اپنی لیبارٹری میں بلوا لے گا اور تجربہ مکمل ہونے کے بعد ہو سکتا ہے وہ اسے ضائع بھی کر دے یا کچھ بھی کرے' ڈاکٹر زیڈ فاروقی نے اپنی اس عظیم تخلیق کو کھو دیا۔ اسے انتہائی شدت سے اس بات کا دکھ تھا کہ وہ اس کی میموری میں ایک اور اضافہ کر لیتا تو اسے دقت نہ ہوتی اور اضافہ یہ ہوتا کہ جب بھی وہ اپنی کال مشین پر اسے پکارتا روبوٹ اس کے پاس پہنچ جاتا' بہت عرصے تک ڈاکٹر اپنے اس روبوٹ کی واپسی کا انتظار کرتا رہا اور جب اس سے مایوس ہو گیا تو اس نے ایک اور روبوٹ تیار کیا' روبوٹ نمبر ایک سو اٹھائیس اور اس کے سپرد یہ ذمے داری کی گئی کہ وہ اس مفرور روبوٹ کو تلاش کرے' خاتون پچھلے تین سال سے میں روبوٹ نمبر ایک سو ستائیس کو تلاش کرنے میں مصروف تھا' بمشکل تمام آج میں اس تک پہنچ سکا ہوں۔ آپ کے ساتھ جو شخص بیٹھا ہوا ہے اگر اس نے آپ سے یہ کہا ہے کہ وہ کوئی انسان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ جھوٹ بھی باآسانی بول سکتا ہے اور اس جھوٹ کو نبھا بھی سکتا ہے'

نہیں ون ٹو سیون اپنی جگہ بیٹھے رہو' ڈاکٹر زیڈ نے مجھے یہ برقی آلہ بھی دیا ہے جو تمہارے نظام کو ناکارہ کر سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان نے اپنی جیب سے ایک چوکور پستول نما چیز نکالی اور اس کا رخ شامل کی جانب کر کے بٹن دبا دیا' ٹرچ کی ہلکی سے آواز نکلی اور شامل بے جان ہو گیا' زویا کے حلق سے ہلکی سی آواز نکلی تو سامنے بیٹھے نوجوان نے کہا۔

''پلیز خاتون...... آپ تو خوش قسمت ہیں کہ آپ کو بہت جلد یہ پتہ چل گیا کہ آپ کا ساتھی کوئی انسان نہیں ہے۔ براہ کرم اسے باہر تک لے جانے میں میری مدد کریں۔ پلیز...... پلیز......''

ختم شد

آفت

جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

احسان نے اپنی جوانی کے بہت سے سال عیش و عشرت میں گزارے تھے لیکن ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اسے یہ احساس ہوا کہ جوانی کس طرح چلی جاتی ہے' کبھی کبھی تو دل چاہتا تھا کہ خودکشی کر لیں بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے' اخبارات میں بہت سے اشتہارات پڑھنے کو ملتے تھے' بڑھاپے سے نجات حاصل کیجئے' جوانی اپنایئے' دفعتہً ہی اسے خیال آیا کہ اس کے دادا کی لائبریری میں ایک کتاب بھی جس میں درج تھا کہ انسان طویل عرصے تک اپنے آپ کو جوان رکھ سکتا ہے' وہ کتاب کی تلاش میں مصروف ہو گیا' آخر کار اسے کتاب مل گئی' کتاب میں ہلکی ہلکی دیمک لگی ہوئی تھی' لیکن اندر کا مضمون متاثر نہیں ہوا تھا' ساری رات وہ اس کتاب کو پڑھتا رہا' اس جادو کی کتاب میں بہت سے معاملات تھے۔ امتحانات میں امتحان دیئے بغیر کامیابی حاصل کی جا سکتی تھی' سنگدل محبوب کو موم بنایا جا سکتا تھا' ظالم حاکم کو رام کر کے مقدمہ جیتا

جا سکتا تھا' گوبر سے بچھو بنائے جا سکتے تھے اور ہمزاد کو قابو میں کر کے ہر طرح کے کام لئے جاتے تھے' آخر کار صبح ہوتے ہوتے اس نے اپنے لیے ایک جادو کا انتخاب کر لیا۔

دوپہر کو بارہ بجے اس نے فرش پر ایک حصار کھینچا' حصار میں نقوش لکھے اور بدبو دار چیزیں سلگا کر حصار میں بیٹھ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد اچانک بادل گرجنے کی آواز آئی' بجلی کا تڑکا ہوا اور کافور کی تیز بدبو اس کے چاروں طرف پھیل گئی' پھر اس نے دیکھا کہ حصار کے باہر لمبے لمبے سینگوں والا دیو جیسا ایک شخص کھڑا ہوا ہے' اس کی ناک سے دھواں نکل رہا ہے اور دو دانت منہ سے باہر نکلے ہوئے ہیں' اس کے ہاتھ میں کسی بچے کا کٹا ہوا سر ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے' دوسرے ہاتھ میں پیالہ ہے جس میں ٹپکتا ہوا خون جمع کر کے وہ اپنی سیاہ زبان سے چاٹ رہا ہے۔

''کون ہو تم؟'' اس نے سر سے پاؤں تک کانپتے ہوئے پوچھا۔

''وہی جس کے لیے تم یہ جنتر منتر پڑھ رہے تھے۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟'' وہ اپنی کپکپاہٹ کو روکتے ہوئے بولا۔

''آفت ...... سمجھے ...... بس اتنا کافی ہے۔''

''تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں یہاں آنے کی زحمت کیوں دی ہے؟''

''بول کیا مانگتا ہے؟'' آفت نے کہا۔

''تین خواہشیں۔''

''بیوقوف ہے تو...... تین خواہشوں کا دور چلا گیا ہے ...... اب صرف ایک خواہش پوری کی جاتی ہے' چنانچہ جو کچھ تجھے مانگنا ہے خوب اونچ نیچ پر غور کر کے مانگ...... کیونکہ اس ایک خواہش کے علاوہ میں تیری اور کوئی خواہش کبھی پوری نہیں کروں گا۔''

"ٹھیک ہے میری بھی ایک ہی خواہش ہے۔"

"بیان کر......میں جانتا ہوں کہ خواہش پوری ہوتے ہی لوگ میری خدمت کو فراموش کر دیتے ہیں اور اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں' اچھا ایک بات بتاؤ' کیا تم اس بچے کا ٹپکتا ہوا خون پینا پسند کرو گے۔"

"کک...... کیا......کیا یہ خواہش پوری کرانے کے لیے اس بچے کا خون پینا ضروری ہے۔"

"نہیں ...... یہ صرف ایک دوستانہ پیشکش ہے۔"

"تمہاری پیشکش کا بہت بہت شکریہ۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں جس کام کے لیے طلب کیا گیا ہے اسے انجام دو۔"

"ٹھیک ہے اپنی خواہش کا اظہار کرو حالانکہ میں اسے جانتا ہوں۔

"اگر جانتے ہو تو مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"چلو ٹھیک ہے۔" آفت نے حصار کے باہر پیالہ رکھ کر اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور پھر جب اس کا ہاتھ واپس نمودار ہوا تو اس نے بہترین قسم کا ایک سوٹ سنبھالا ہوا تھا' اس نے یہ سوٹ حصار کے اندر اچھالتے ہوئے کہا۔

"اسے پہن لو۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ اب میں کبھی واپس نہ آنے کے لیے جاتا ہوں۔"

اس نے جلدی جلدی سوٹ پہنا اور سوٹ پہنتے ہی اسے اپنی رگ و پے میں نیا نیا خون دوڑتا ہوا محسوس ہونے لگا' جسم کی ساری طاقت توانائی واپس آ گئی' وہ اپنے آپ کو بیس بائیس سال کا نوجوان محسوس کرنے لگا۔ خوشی کے عالم میں بھاگتا ہوا حصار

سے باہر نکلا' سب سے پہلے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے سراپے کا جائزہ لیا' جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ وہ خوشی خوشی باہر نکل آیا' زندگی کی ہر خوشی اس کے سامنے تھی' سوٹ کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ اپنی دوسری خواہشوں کے ساتھ ساتھ وہ جس لڑکی کو نظر بھر کر دیکھ لیتا وہ دیوانہ وار اس کے قدموں میں آ گرتی۔ آخر کار اس نے ایک لڑکی کو پسند کیا اور وہ کچے دھاگے میں بندھی ہوئی اس کے پاس کھنچی چلی آئی۔

"کتنی حسین ہو تم؟"

"تم بھی تو کسی سے کم نہیں ہو۔"

"میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔"

"حکم دو۔"

"میرے گھر چلو گی۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" وہ اس کے ساتھ آگے بڑھ کر کار میں آ بیٹھی' ابھی کار نے آدھا ہی راستہ طے کیا تھا کہ اچانک ہی اس پر ایک خوف سا طاری ہو گیا' اسے یاد آ گیا کہ یہ سوٹ' یہ سوٹ ہی اس کی آرزوؤں کی تکمیل ہے۔ اگر یہ بدن سے جدا ہوا تو کیا ہوگا اور اس کے سارے وجود میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

"آہ یہ تو...... یہ تو ٹھیک نہیں ہے' یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے سوچا۔

ختم شد

تعمیل

جنید کو آج پھر کافی دیر ہو گئی تھی اور وہ گھر میں ہونے والے ڈرامے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ حسب معمول وہ ڈرتے ڈرتے کال بیل بجائے گا' دو تین بار بیل بجانے کے بعد ملازم دروازہ کھولے گا' ڈائننگ ٹیبل پر کھانا ڈھکا رکھا ہو گا' ملازم کے ذریعے پتہ چلے گا کہ جنید کی بیوی شازیہ اپنے بیڈ روم میں چلی گئی ہے۔ وہ ڈرتے ڈرتے بیڈ روم میں داخل ہو گا۔ شازیہ بظاہر بستر پر سوتی ہوئی ملے گی۔ جنید باتھ روم سے کپڑے چینج کر کے واپس آئے گا تو بیڈ روم کا دروازہ اندر سے بند ہو چکا ہو گا جبکہ شازیہ بیڈ پر اسی انداز میں پڑی ہوئی ہو گی۔ پھر جنید ڈرتے ڈرتے بیڈ پر بیٹھے گا' شازیہ کروٹ بدل کر اس سے بازپرس شروع کرے گی۔ وہ گڑبڑا کر الٹے سیدھے جواب دے گا اور پھر شازیہ کا پارہ ہائی ہو جائے گا اور پھر فحش جملوں کے ساتھ جنید کی درگت بنی شروع ہو گی۔ اف توبہ......

جنید کو جھرجھری آ گئی تھی۔ وہ ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم تھا' جنید کے ماں باپ رشتے دار وغیرہ کوئی تھا نہیں' شازیہ کا میکہ دوسرے شہر میں تھا۔ اس لیے وہ اس شہر میں اکیلے ہی تھے۔ فرم میں اس کی اچھی ساکھ تھی اور اس ساکھ کو برقرار رکھنے کے

لیے اسے خاصی محنت کرنا پڑتی تھی۔ اس کی فرم میں کئی ایک لڑکیاں بھی اس کے ساتھ کام کرتی تھیں جن کی بناء پر بیگم کی شکی مزاج طبیعت جنید کے سامنے ابھر کر آئی۔ جب بھی وہ دیر سے گھر آتا تو شازیہ اس سے بازپرس کرتی اور یہی کہتی کہ وہ ضرور ان لڑکیوں کے ساتھ وقت گزاری کر رہا ہو گا۔ پھر وہ جنید سے لڑنا شروع ہو جاتی اور پھر بات مار پیٹ پر ختم ہوتی۔

جنید کو سب سے زیادہ اس بات سے چڑ تھی کہ بیوی بے شک دروازہ بند کر کے مارتی ہے' لیکن ملازموں تک آواز آسانی سے پہنچتی ہے' نہ صرف ملازم بلکہ پڑوسی بھی مفت کے پروگرام سے لطف انداز ہوتے ہیں اور اکثر جنید کو مسکراتی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ ایک بار تو محلے کی ایک تقریب میں ایک پڑوسی نے مذاق ہی مذاق میں کچھ باتیں کیں اور جنید نے ان سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔

بہرحال وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آج بھی اس کے ساتھ یہی سب کچھ ہو گا۔ اسٹاپ پر اتر کر وہ گھر کی جانب چل پڑا جو اس کے گھر سے کافی فاصلے پر تھا۔ گھر کے راستے میں ایک پارک پڑتا تھا' پارک دیکھ کر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا' اسے آفس میں کل کا پورا دن آؤٹ ڈور گزارنا تھا۔ اس نے سوچا کہ آج رات وہ گھر نہیں جائے گا کھانا وغیرہ پہلے ہی کھا چکا تھا اور اب وہ رات اس پارک میں گزارے گا' کل کا پورا دن آؤٹ ڈور گزارے گا' ظاہر ہے بیوی پریشان ہو گی۔ پھر دوسری رات گھر پہنچ کر کوئی کہانی سنا دے گا اور پھر بیوی کا ردعمل دیکھے گا۔

اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جنید نے پارک میں ایک صاف ستھری بینچ دیکھی اور اس پر نیم دراز ہو گیا۔ ہاتھ کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا اور مزے سے تاروں بھرے آسمان کو دیکھنے لگا۔ ابھی اسے بیٹھے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ بے اختیار اس کی نگاہ بینچ پر دائیں جانب پڑی اور وہ ایک دم چونک گیا۔ کچھ

لمحے پہلے تک دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا اور اب اچانک یہ شخص کہاں سے نمودار ہو گیا۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے بالکل جنید جیسے کپڑے پہنے ہوئے شکل و صورت میں بھی وہ بالکل جنید کی فوٹو کاپی محسوس ہو رہا تھا۔ جنید حیرت زدہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا' اس اجنبی شخصیت نے خود ہی جنید کو مخاطب کر کے کہا۔

''ہیلو جنید کیسے ہو؟''

''ج..... جی..... کک..... کون..... کون.....؟'' جنید کے منہ سے صرف اتنا ہی نکل سکا۔

''کیوں' مجھے نہیں پہچانا' غور سے مجھے دیکھو' وہی ہاتھ وہی پاؤں' وہی چہرہ وہی کپڑے بالکل تم یا میں' ایک ہی بات ہے۔''

''دو..... دیکھو..... تت..... تم کیا کہہ رہے ہو۔ مم ..... میں..... میں..... تم..... تم.....''

''ہاں تم' تم ہو اور میں بھی تم ہوں۔''

''کک..... کیا مطلب؟''

''جنید..... تم نے سنا ہو گا کہ دنیا میں ہر شخص کا ایک ہمزاد ہوتا ہے جو اس کے ساتھ ہمہ وقت موجود رہتا ہے' بس! میں اس وقت بھی تمہارے ساتھ ہوں' فرق یہ ہے کہ میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔''

جنید کے ذہن میں وہ کہانیاں گردش کرنے لگیں جن میں اس نے سنا تھا کہ ہمزاد جسم سے الگ ہو جاتے ہیں اور پھر وہ مختلف کام انجام دے کر واپس جسم سے آ ملتے ہیں' پھر جنید خود کو نارمل کرنے لگا اور اس نے کہا۔

''تو تم میرے ہمزاد ہو؟''

''جناب!''

''تب تو تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو۔''

''بالکل کر سکتا ہوں' حکم فرمایئے؟'' ہمزاد نے کہا اور جنید سوچ میں پڑ گیا' پھر اس نے سوچا کہ آج رات ہمزاد کو گھر بھیجا جائے' کم از کم یہ رات تو سکون سے گزرے گی اور پھر یہ رات ہی کیا' جب بھی اسے آفس میں دیر ہو جائے گی وہ ہمزاد کو آواز دے گا اور اسے گھر بھیج کر خود کسی پارک میں رات گزار لے گا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد اس نے ہمزاد سے کہا۔

''ہمزاد بھائی! تمہیں میرا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔ آج تم میری جگہ میرے گھر چلے جاؤ اور رات وہاں گزارو' صبح واپس یہیں آ جانا' بس۔''

''بس..... اتنا سا کام..... او کے میں جا رہا ہوں۔'' ہمزاد نے کہا اور پھر پلک جھپکتے وہ غائب ہو گیا۔ جنید پھر اپنی جگہ پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ پھر ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس نیند کی وادی میں پہنچا دیا تھا۔

پھر اچانک ہی جنید کے گال پر زوردار تھپڑ پڑا تھا جس نے اسے بری طرح جھنجھنا کر رکھ دیا تھا' اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سامنے ہی اسے اپنا ہمزاد نظر آ گیا تھا۔ ناک کے نتھنے پھولے ہوئے تھے' ہونٹوں سے تھوک اڑ رہا تھا۔ لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور حالت کافی ابتر نظر آ رہی تھی' پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہمزاد کا ہیولا اس کی نگاہوں سے معدوم ہو گیا تھا۔ پہلے تو جنید پر حیرت زدہ کیفیت طاری رہی پھر جب وہ ماحول سے مانوس ہوا تو آہستہ آہستہ اسے ساری باتیں یاد آ گئی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی' پھر یہ مسکراہٹ قہقہوں میں بدل گئی اور وہ کافی دیر تک ہنستا رہا تھا۔

ختم شد

برگد کی روح

حادثہ اچانک ہی ہوا تھا' اور میں نے دیکھا تھا کہ نازیہ کار کی لپیٹ میں آ گئی' سڑک پر خون ہی خون بکھر گیا تھا۔ میں ششدر اسے دیکھتا رہ گیا۔ لاہور یونیورسٹی میں پڑھتا تھا' نازیہ میری کلاس فیلو تھی۔ لیکن ایک بڑے باپ کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے وہ بہت بگڑی ہوئی تھی جبکہ دردانہ کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ ماں باپ بیچارے تو بس اس کی خوشی پوری کرنے کے لیے پڑھا رہے تھے' دردانہ اور میں ایک دوسرے کو ذہنی طور پر قبول کر چکے تھے اور ہم لوگوں نے کوششیں شروع کر دی تھیں کہ تعلیم کے خاتمے کے بعد ہمارے والدین ہماری شادی کر دیں۔

بہرحال نازیہ درمیان میں تھی اور اس نے ایسی بری بری سازشیں کیں کہ ہم یونیورسٹی میں بدنام ہو گئے۔ بیچاری دردانہ تو اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ اس نے یونیورسٹی ہی چھوڑ دی' بہرحال اس کے بعد نازیہ کو اس کے کیے کی سزا ملی۔ شدید زخمی ہو کر ہسپتال پہنچی تھی وہ۔ تھوڑی دیر کے لیے ہوش آیا تھا' میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس کی عیادت کو پہنچا تھا اس نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

''یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں ایسے ہی چھوڑ دوں گی' مرنے کے بعد بھی تمہارا

پیچھا کروں گی۔'' یہ بات اس نے شدید بری حالت میں بھی کہی تھی' پھر وہ جانبر نہ ہو سکی اس کی موت کا مجھے بھی افسوس ہوا تھا بہرحال کچھ عرصے کے بعد یہ تصور میرے ذہن سے نکل گیا۔

پھر قدرت نے ہمارا ساتھ دیا' میری شادی دردانہ ہی سے ہوگئی' شادی کے بعد ہم ہنی مون منانے کے لیے مری گئے' یہاں میرے ایک دوست کا ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا اس نے ہمیں چابی دے دی تھی۔ مری کی خوشنما وادی میں سیر کرتے ہوئے ایک دن جب ہم گھر واپس آئے تو گھر کا ملازم بے ہوش پڑا ہوا تھا' بمشکل تمام اسے ہوش میں لایا گیا تو اس نے بتایا کہ وہ صحن میں بیٹھا ہوا کچھ کام کر رہا تھا کہ اچانک دروازے سے ایک لڑکی داخل ہوئی جو انتہائی خوفناک شکل کی تھی۔ وہ صحن میں موجود برگد کے درخت کے پاس آ کر غائب ہوگئی۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

اسی رات پیاس کی وجہ سے میری آنکھ کھلی میں پانی لینے کے لیے باہر نکلا تو میں نے نازیہ کو صحن میں کھڑے ہوئے دیکھا' اس نے مجھے مخاطب کر کے خونخوار لہجے میں کہا کہ میں اپنی بربادی کے لیے تیار ہو جاؤں' مجھ پر کچھ اس طرح خوف طاری ہوا کہ میں دوسرے ہی دن دردانہ کو واپس لے کر لاہور آ گیا اور واقعی نازیہ نے اپنے کہے ہوئے پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ ایک دن صبح کو میں اٹھا تو میرے والد کی لاش مجھے ملی' والدہ لاش کے پاس بے ہوش پڑی ہوئی تھیں' والد کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے۔ میری اور دردانہ کی حالت خراب ہوگئی' وہ اس قدر دہشت زدہ ہوگئی کہ مجھے اسے میکے بھیجنا پڑا۔ باپ کی موت کا مجھے شدید رنج تھا' ماں بھی ادھ مری ہو گئی تھیں۔

بہرحال کئی دن گزر گئے' ایک رات کو سو رہا تھا کہ میں نے اپنے کمرے کے دروازے پر قدموں کی چاپ سنی جاگ کر دیکھا تو دردانہ تھی جو آ گئی تھی۔

"ارے تم اس وقت یہاں کیسے؟"

"بس ایسے ہی آ گئی' میں نے سوچا تم اکیلے ہو گے ٹھہرو تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" نجانے کیوں مجھے دردانہ کی کیفیت کچھ عجیب سی لگی تھی' میں اس کے پیچھے پیچھے باورچی خانے پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں دردانہ کی جگہ نازیہ موجود تھی' ایک بھیانک شکل لئے' میرے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ نازیہ بولی۔

"کب تک بچو گے مجھ سے؟ کب تک بچو گے؟" اس کے بعد وہ غائب ہو گئی۔ بہرحال میں دردانہ کی طرف سے پریشان ہو گیا تھا۔ پھر نجانے کیا کیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی کبھی گھر میں کالی بلیاں ادھر سے ادھر ہوتی نظر آتی تھیں۔ اور پھر تین چار دن کے بعد وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا' مجھے اچانک اطلاع ملی کہ دردانہ چھت سے گر کر ہلاک ہو گئی ہے۔ میں پاگل ہو گیا تھا' کیا گزر رہی تھی مجھ پر' واقعی نازیہ نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا' بہرحال اب میرا کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا اور میں بھٹکتا ہی پھرتا تھا۔ ایک دن میں ایک مخصوص علاقے سے گزر رہا تھا کہ ایک بزرگ نے مجھے روک لیا' کہنے لگے۔

"میرا نام محمد علی قادری ہے اور میں کراچی میں رہتا ہوں' اکثر میں اپنے لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے لاہور بھی آتا جاتا رہتا ہوں' مجھے معلوم ہے کہ تیرے ساتھ کیا گزری ہے۔ میرے ساتھ چل تو دیکھ میں اس خبیث بدروح کا کیا حال کرتا ہوں۔" میں ان کے ساتھ اپنے گھر آ گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ جب تک میں اس بدروح کا خاتمہ نہیں کر لیتا چین سے نہیں بیٹھوں گا' قادری صاحب مجھے اپنے گھر کے لان میں ایک گڑھا کھودنے کا حکم دے کر کچھ پڑھنے میں مصروف ہو گئے' پھر انہوں نے مجھے بہت ساری لکڑیاں لانے کے لیے کہا اور میں نے ان سب پر عمل کیا پھر وہ کہنے لگے۔

"میں چلتا ہوں ضرورت کے وقت آ جاؤں گا' تم خوفزدہ نہ ہونا۔"

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا' گھر میں جیسے زلزلہ آ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے نازیہ کی روح کو دیکھا' اتنی بھیانک شکل ہو رہی تھی اس کی کہ انسان دیکھ کر فوراً ہی مر جائے۔ آنکھوں کی جگہ سانپ تھے' منہ سے ایک لمبی زبان لٹک رہی تھی جو دو شاخی تھی' جسم سیاہ بالوں سے بھرا ہوا تھا' میں نے قادری صاحب کی بتائی ہوئی آیتوں کا ورد شروع کر دیا۔ ابھی نازیہ کی روح کچھ کہنے ہی والی تھی کہ قادری صاحب آ گئے انہوں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"بد باطن عورت' اب تیری تباہی سے کوئی شیطانی طاقت تجھے نہیں بچا سکتی۔ تو نے دنیا کے قانون کو پامال کر دیا ہے اور اب تیرا آخری وقت ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے کچھ پڑھنا شروع کر دیا اور میں نے نازیہ کی روح کو اس گڑھے میں گرتے ہوئے دیکھا' قادری صاحب کے حکم پر میں نے لکڑیاں اس کے اوپر ڈال دیں' تھوڑی دیر کے بعد ان لکڑیوں میں آگ بھڑک اُٹھی اور یہ آگ شعلوں میں تبدیل ہو گئی پھر ایک سرخ شعلہ گڑھے سے باہر نکلا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد وہاں راکھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

یہ آخری دن تھا اس کے بعد میں مشکلوں سے نکل آیا بہرحال کبھی کبھی انسان اس طرح بھی عذاب کا شکار ہو جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری بھی اپنے بندوں کو ہی سونپی ہے کہ وہ ارواح خبیثہ اور شیطانی ارادے رکھنے والوں سے معصوم اور مظلوم انسانوں کو بچائیں اور محمد علی قادری صاحب ہی نیک فریضے کو بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ صرف خونی کہانی نہیں بلکہ ایک بالکل سچی کہانی ہے۔

ختم شد

اے وطن

سرزمین وطن غاصبوں کے قبضے میں تھی اور وطن والے دربدر بھٹک رہے تھے‘ دونوں باپ بیٹے تپتے ہوئے ویران لق و دق صحرا میں کسی منزل کی تلاش میں چلے جارہے تھے اور بار بار ان لوگوں کے بارے میں باتیں کرنے لگتے۔ جن کے چہرے سرخ‘ آنکھیں نیلی اور بال بھورے تھے اور وہ ان کے ملک پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ وہ اپنے وطن کی سرزمین کو ان غاصبوں کے قبضے سے ہر قیمت پر آزاد کرا لینا چاہتے تھے۔ انہیں ان غاصبوں سے شدید نفرت تھی۔ اس وقت بھی سورج کی شعاعیں آگ برسا رہی تھیں اور تپتی ہوئی ریت پر گھسٹتے ہوئے بوڑھے جسم میں تھکن آتی جارہی ہے‘ انہیں ابھی کافی دور تک جانا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”گرمی کی شدت نے تمہارا حال بھی بہت خراب کر دیا ہے اور میرے بدن میں تو جیسے جان ہی نہیں رہی ہے۔ میرا خیال ہے گرمی کی شدت کم ہونے تک ہم دونوں آرام کر لیں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں۔“ بیٹے نے باپ کی کیفیت دیکھ کر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے اپنے چہرے پر رومال لپیٹے اور

ریت پر لیٹ گئے۔ آہستہ آہستہ ان کی آنکھوں میں غنودگی آ گئی۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں گزرا ہو گا کہ اچانک شوروغل سے بوڑھے کی آنکھ کھل گئی اور پھر اس نے اس غاصب قوم کے افراد کو دیکھا۔ جنہوں نے اس کی سرزمین پر اپنا تسلط قائم کر رکھا تھا۔ سرخ چہرے نیلی آنکھیں بکھرتے بال ان کے کندھوں سے بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ مگر ان کی حالت دیکھ کر بوڑھے نے اندازہ لگایا کہ غالباً وہ اس طویل ریگستان میں بھٹک کر ادھر آ نکلے ہیں۔ ان کی حالت انتہائی خراب ہورہی ہے خشک ہونٹ بکھرے ہوئے غبار آلود بال اور چہروں پر بے پناہ تھکاوٹ کے آثار‘ گردوغبار نے ان کی شکلیں بگاڑ کر رکھ دی تھیں۔ ان کے لباس کی حالت بتا رہی تھی کہ کئی دن سے صحرا میں بھٹک رہے ہیں۔ ان کے پیر بمشکل تمام جلتی ریت پر آگے بڑھ رہے تھے۔

انہوں نے ان دونوں کو دیکھ لیا تھا اس لیے ان کا رخ اسی طرف تھا۔ ہانپتے کانپتے حال سے بے حال وہ لپک کر بوڑھے کے پاس پہنچے اور بوڑھے نے یہ اندازہ لگا لیا کہ پانی نہ ملنے کے سبب یہ جاں بہ لب ہورہے ہیں اور ایسی حالت صحرا میں صرف ایک ہی سبب کے تحت ہوسکتی تھی۔ یعنی پیاس کی شدت صحرا کا وہ اژدہا جو کسی صورت کسی کے قابو میں نہیں آتا اور دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کو نگل جاتا ہے۔ ایک فرد نے آگے بڑھ کر بوڑھے سے کہا۔

”بڈھے! یہاں پانی کا قریب ترین چشمہ کہاں ہے؟ ہم پچھلے تین دن سے اس صحرا میں راستہ بھٹک کر بھوکے پیاسے گھوم رہے ہیں۔ شکر ہے تیری شکل نظر آئی۔ اب جلدی چل ہمیں کسی چشمے کے قریب لے چل۔ تاکہ ہم اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں کو تر کر سکیں۔ اس کی آواز میں موت کی قربت کے باوجود رعونت تھی۔ بوڑھے نے ایک لمحے اسے دیکھا اور اس کے چہرے پر سکون کے آثار پھیل گئے۔ اس کے تجربے نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ یہ پیاسے لوگ پانی کے بغیر اب بہت مختصر وقت کے مہمان ہیں اس

نے اپنے بیٹے کی طرف نظر ڈالی جو گہری نیند میں بے خبر پڑا سو رہا تھا۔

بوڑھے نے اپنے ذہن میں اٹھنے والے خیالات کو کریدا۔ وہ باتیں تازہ ہو گئیں جو ان غاصب لوگوں کے بارے میں اس نے سنی تھیں۔ اسی وقت اس شخص کی آواز ابھری۔

''او پاگل بڈھے۔ کیا تو گونگا اور بہرا ہے میں نے تم سے کہا ہے کہ ہم بھوکے اور پیاسے ہیں۔'' ابھی اس کے الفاظ پورے بھی نہ ہوئے تھے کہ ان میں سے ایک شخص چکرا کر گر پڑا اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ ایک بار پھر سردار نے بوڑھے سے پانی کے بارے میں پوچھا۔ لیکن اس بار اس کی آواز میں پہلے جیسی رعونت نہیں تھی۔ اس نے اسے انسانیت کے واسطے دیئے اور پھر قتل کرنے کی دھمکی دی۔ پھر اچانک ہی اس آنکھوں میں ایک شیطانی چمک نظر آئی۔ اس نے کہا:

''بے وقوف۔ بوڑھے اگر تو نے ہمیں پانی کے بارے میں نہ بتایا تو ہم تیرے اس بیٹے پر تشدد کریں گے۔''

''میں نہیں جانتا کہ آپ کون لوگ ہیں۔ مگر یہ جانتا ہوں کہ آپ کو اگر فوراً پانی نہ ملا تو آپ اپنے ساتھ ساتھی کی طرح زندگی سے محروم ہو جائیں گے۔ میں آپ لوگوں کو اس طرح مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا میں آپ کو پانی تک لے جاؤں گا لیکن اگر میرا بیٹا جاگ گیا تو آپ یقین کیجئے وہ مجھے فوراً ختم کر دے گا کیونکہ وہ آپ لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔ اس لیے پہلے کہ میں آپ کی رہنمائی کروں۔ آپ مجھے اس لڑکے کو قتل کرنے کی اجازت دے دیں۔ میں آپ لوگوں کو بچانے کے لیے اس کی جان لینے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔'' اس شخص نے حیران نگاہوں سے بوڑھے کو دیکھا اور پھر ان میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر اپنی بھری بندوق بوڑھے کے ہاتھوں میں تھما دی۔ بندوق کے ہاتھ میں آتے ہی بوڑھا لرزنے

لگا۔ پھر اس نے بمشکل تمام بندوق تانی اور اپنے بیٹے کے جسم کا نشانہ لینے لگا۔ فائر کرنے سے پہلے ایک بار اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ اور آخرکار اس نے بندوق کا ٹریگر دبا دیا۔ گولیاں لگتے ہی نیند میں سوئے ہوئے بے خبر نوجوان نے ایک دلدوز چیخ ماری اور بری طرح ریت پر تڑپنے لگا۔ پھر چند لمحوں کے بعد اس کا جسم بے حس و حرکت ہو گیا۔ ضعیف باپ کی کمر جھک گئی۔ وہ بندوق کا سہارا لیتے ہوئے ریت میں بیٹھ گیا اور پھر کچھ لمحوں کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بندوق اس کے مالک کی جانب بڑھا دی اور لرزتی آواز میں بولا:

''غاصبو! میری مادر وطن کی بے حرمتی کرنے والے ظالمو! اب تم میرے ساتھ جو سلوک چاہو کرو۔ تمہارے مقدر میں اس سرزمین غیر میں دفن ہو جانا لکھا جا چکا ہے۔ میں پانی کے چشمے کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو۔''

''سچ کہہ رہا ہوں میں۔''

''لیکن تم نے اپنے بیٹے کو کیوں مار دیا۔''

''آہ۔ میں جانتا تھا کہ میرا بیٹا تمہاری دھمکیوں کی تاب نہ لاتے ہوئے تمہیں پانی کے چشمے تک لے جاتا اور تم تازہ دم ہو جاتے۔ لیکن اب یہ بے آب و گیاہ صحرا' یہ بیابان وسیع و عریض ریگستان تمہاری پیاس بجھانے کے بجائے تمہارے جسموں' تمہاری ہڈیوں تک کا رس چوس لے گا۔ میں نے اپنی ارض مقدس کو پامال کرنے والے درندوں سے انتقام لے لیا ہے۔ بس میں اتنا ہی کر سکتا تھا۔''

بوڑھے نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے اور آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا کچھ لمحوں کے بعد اس کا سر اپنے بیٹے کے سینے سے جا لگا۔ اس نے خود بھی دم توڑ دیا تھا۔

ختم شد

کیا خیال ہے؟

پہلے میرا خیال تھا کہ ہر انسان کسی نہ کسی جانور کی نمائندگی کرتا ہے۔ یعنی جانور کی فطرت اپنے اندر رکھتا ہے۔ کوئی فطرتاً شیر ہے۔ کوئی گائے ہے اور کوئی کتا وغیرہ...... میرا مشاہدہ اس بات کی تصدیق کرتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کوئی شیر کی طرح کمزور کی بوٹیاں نوچ رہا ہے اور کوئی گیدڑ کی طرح پرے بیٹھا اس کے سیر ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔ کوئی لومڑی کی طرح مکار ہے' کوئی گدھے کی طرح مالک کے ڈنڈے کھا رہا ہے اور کوئی گلی میں بیٹھا کتے کی بھونک رہا ہے اور کچھ شاہین کی مانند فضا میں پرواز کر رہے ہیں۔

بہرحال یہ بات تو طے تھی کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ انسان وہی کچھ کرتا ہے جو خدا اس کی فطرت میں رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ یہ تمام جمع تفریق کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر میں چور اچکا ہوں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ خدا نے یہی خوبی میرے اندر رکھی ہے۔ ضروریات زندگی تو بہرحال پوری کرنی ہی ہوتی ہیں اور میں اپنی ان صلاحیتوں سے کام لے رہا تھا جو خدا نے مجھے دی تھیں یعنی بینکوں میں رقم بغیر جمع کرائے' نکالنے کی ترکیب مجھے آتی ہے۔

لوگوں کو کچھ دیئے بغیر ان سے لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ بوقتِ ضرورت سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کار اڑا لینا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

بہرحال یہ میری تھیوری ہے کوئی مانے یا نہ مانے۔ پچھلی دفعہ میں ایک ایسے شخص کے گھر سے چوری کرتے پکڑا گیا تھا جو کھلے عام رشوت لیتا تھا اس نے مجھ پر اپنی دریا دلی کا رعب ڈالنے کے لیے کہا:

''اگر تمہیں پیسوں کی ضرورت تھی تو مجھ سے ویسے ہی مانگ لیتے۔'' مجھ اس کی یہ بات سن کر غصہ آ گیا۔ میں نے کہا۔

''میں کوئی بھک منگا نہیں ہوں جو مانگ لیتا۔ تم کیوں نہیں اپنی ضرورت کے لیے کسی سے کچھ مانگ لیتے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''تم لوگوں سے رشوت لیتے ہو۔ خدا سے کیوں نہیں مانگتے میں چور ہوں اور تم رشوت خور ہمارے درمیان صرف یہی فرق ہے۔''

بہرحال مجھے عدالت میں پیش کیا گیا۔ میں نے مجسٹریٹ کو اپنی تھیوری سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ ایک عمر رسیدہ اور نرم مزاج مجسٹریٹ تھا اس نے میری بات پر غصہ نہیں کیا۔ اس سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا اور میں نے کہا:

''جناب عالی! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انسان وہی کچھ کرتا ہے اور کر سکتا ہے جو قدرت نے اس کی فطرت میں رکھا۔ مثلاً آپ اپنی مثال لے لیں۔ خدا نے آپ کو عدالت میں انصاف کرنے کی صلاحیت دی ہے۔ آپ میری طرح چوری نہیں کر سکتے اور میں آپ کی طرح عدالت نہیں کر سکتا۔''

بہرحال مجسٹریٹ نے میری بات کا جواب کچھ دن کے بعد دے دیا۔ اس نے کہا:

"خدا نے مجھے جو عدالت کرنے کی صلاحیت دی ہے اسے کام میں لاتے ہوئے میں تمہیں ایک سال قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں۔" بات اس کی بھی ٹھیک تھی۔ لیکن میرے نظریئے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ میری منگیتر اس سے اتفاق نہیں کرتی۔ خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو ان دنوں ریاض الدین کے چکر میں تھا جو ایک جیولری اسٹور کا سیلز مین تھا اور لاکھوں روپے کے زیورات بریف کیس میں لے کر ادھر ادھر گردش کرتا رہتا تھا۔ میری نگاہ میں وہ ایک بے وقوف آدمی تھا کہ موقع سے فائدہ نہیں اٹھاتا تھا اور تیار نہیں تھا لیکن میں بے وقوف نہیں تھا میں نے ان زیورات کے حصول کا منصوبہ تیار کر لیا۔ اگلے روز میں ٹھیک دو بجے جیولری اسٹور والی گلی میں موجود تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا کہ آج خلاف معمول ریاض الدین کی گاڑی ایک عمارت کے عقب میں کھڑی تھی اور یہ جگہ زیادہ سنسان تھی۔ بہر حال میں ایک فٹ لمبی لوہے کی ایک راڈ جسے میں نے اپنے کوٹ کے اندر چھپا رکھا تھا لئے ہوئے وہاں پہنچ گیا۔ میرا منصوبہ تھا کہ جب ریاض الدین کار میں بیٹھ جائے گا تو میں دروازہ بند ہونے سے پہلے اس کے سر میں چوٹ لگاؤں گا اور اس کی کار میں بیٹھ کر ہی فرار ہو جاؤں گا۔ دو بجکر گیارہ منٹ پر میں گلی کے کونے سے باہر نکلا۔ ریاض الدین سوا دو بجے باہر نکلتا تھا۔ آخر کار میں نے اسے دیکھا وہ سخت جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔

اچانک ہی میں نے ایک اور نوجوان کو دیکھا جو ریاض الدین سے زور زور سے کچھ کہتا ہوا اس کے ساتھ آ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا چکر تھا۔ پھر جب ریاض الدین نیچے پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اس نے بائیں ہاتھ میں پستول پکڑا ہوا ہے۔ کار کے قریب پہنچ کر وہ ذرا سا جھکا اور پیچھے آنے والے نوجوان پر فائر کر دیا۔ گولی نوجوان کے کندھے پر لگی اور وہ فٹ پاتھ پر گر کر تڑپنے لگا۔ ریاض الدین نے پستول جیب میں

رکھا۔ چابی نکال کر کار کا دروازہ کھولنے لگا میں نے اپنی حیرت پر قابو پا کر اس کا تعاقب کیا اور اس وقت میں نے ریاض الدین کے سر پر چوٹ لگائی جب وہ جھک کر کار کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ چوٹ لگتے ہی وہ آواز نکالے بغیر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اس کے بے جان ہاتھ سے بریف کیس لیا اور کار میں بیٹھنے کا ارادہ لیا۔ لیکن اسی وقت میری نگاہ اس نوجوان پر پڑی۔ میں نہ تو رحم دل انسان ہوں اور نہ ہی خون خرابہ' میرے لیے کوئی نئی چیز ہے۔ لیکن اس وقت پتہ نہیں میرے دماغ میں کیا سمائی۔ میں نے آگے بڑھ کر بریف کیس زمین پر رکھا اور نوجوان کے زخم کو دیکھنے لگا۔ پھر جیب سے رومال نکال کر میں نے خون نکلنے سے روکا اور اسی وقت بہت سے افراد میرے پاس پہنچ گئے۔

بہر حال آپ جانتے ہیں اس کے بعد جو ہونا تھا وہی ہوا۔ میں تو آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نہ جانے کیسے ریاض الدین گدھے کے بجائے شیر بن گیا اور میں شیر کے بجائے بکری' بعد میں پتہ چلا کہ آخر کار ریاض الدین کی نیت خراب ہو گئی تھی اور اس نے اپنے مالک کو لوٹنے اور ملک سے فرار کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس روز جب منیجر اسے زیورات نکال کر دے رہا تھا۔ تو اس نے اسے شوٹ کر دیا تھا۔ جو وہ زیورات اور نقدی نکال کر بھاگا۔ لیکن بدقسمتی سے ایک نوجوان نے فائر کی آواز سن لی اور اس کے پیچھے لگ گیا۔

بہر حال سزا بھی بھگت لی زیورات بھی ہاتھ نہیں لگے لیکن ثریا کو شاید میری یہ ادا پسند آ گئی تھی۔ چنانچہ اب وہ میری بیوی ہے۔

ختم شد

کلائمکس

جدید سائنس کے کرشموں کی حقیقت سے کسے انکار ہے اور خصوصاً میرے لیے تو جدید سائنس ایک نعمت ہے۔ کیونکہ اسی کی بدولت مجھے نئی زندگی نصیب ہوئی ہے۔ ماں باپ کی موت کا صدمہ مجھ پر کچھ ایسا اثر انداز ہوا تھا کہ میری یاداشت جاتی رہی' پھر ڈاکٹرز نے میرے علاج کے لیے جو طریقہ دریافت کیا وہ انتہائی دلچسپ اور انوکھا تھا۔ بہترین ماہر نفسیات نے میرے قانونی مشیر کی مدد سے میری زندگی کے واقعات جمع کئے انہیں ترتیب دیا اور پھر ان کی باقاعدہ فلم بنائی گئی اور مجھے یہ فلم دکھائی گئی ڈاکٹرز کا مقصد یہ تھا کہ اس فلم کی کہانی کا کوئی موڑ میرے ذہن پر اثر انداز ہوسکتا ہے اور میری یاداشت واپس آسکتی ہے۔ فلم کی کہانی کچھ یوں تھی۔

ایک جوان لڑکا اپنے ماں باپ کی جائیداد کا اکلوتا وارث ہے' اس لڑکے کا ایک ماموں ہے جو ان کے ساتھ ہی رہتا ہے اور ان کے کاروباری امور کی دیکھ بھال کرتا ہے' لیکن اس دیکھ بھال کی آڑ میں وہ ان کو کافی لوٹ چکا ہے۔ پھر کسی طرح لڑکے کے باپ کو اس کا علم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے سالے سے باز پرس کرتا ہے۔ حقیقت

کھلنے پر سالا پوری طرح سامنے آجاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے ان تینوں کو اپنے ہی گھر میں قید کر دیتا ہے۔ لڑکا ماموں کی غیر موجودگی میں کسی طرح رسیاں کھولنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مقابلہ کرتا ہے' لیکن ماموں کے ساتھی لڑکے کے ماں باپ کو گولیاں مار دیتے ہیں جبکہ لڑکا شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ ماں باپ کو نظروں کے سامنے مرتا ہوا دیکھ کر لڑکا کوما میں چلا جاتا ہے۔ ماموں بھاگ جاتے ہیں۔" یہ کہانی کئی دنوں کے مختلف اوقات میں دکھائی گئی تھی تاکہ میں کچھ یاد کرسکوں۔ پھر ایک دن یہ فلم مکمل ہوگئی۔

"ہوں' تو آپ لوگ کہتے ہیں کہ میری زندگی کی کہانی ہے۔"

"جی۔" میرے قانونی مشیر نے کہا۔

"اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"کچھ نہیں۔ آپ اپنے کاروباری اُمور دیکھئے۔ میں مسلسل آپ کی رہنمائی کرتا رہوں گا۔"

سب لوگ باہر چلے گئے تھے۔ میں اپنے ذہن پر زور دیتا رہا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ گھر میں ایک بھی تصویر نہیں تھی جس سے میں کسی کو پہچان سکتا۔ لیکن ایک دن مجھے گھر کے ایک کونے سے ایک البم ملا جس میں میری میرے ماں باپ اور میرے ماموں کی تصاویر تھیں۔ ان تصاویر کو دیکھ کر میں سب سمجھ گیا تھا اور اب اس فلم کی کلائمکس مجھے ہی کرنا تھا۔ باورچی خانے سے ایک تیز دھار چھری لے کر میں نے اپنے لباس میں چھپا لی تھی اور اپنے قانونی مشیر کا انتظار کرنے لگا۔

پھر مقررہ وقت پر وہ واپس آگیا تھا۔ اس نے مجھ سے میرا حال چال دریافت کیا۔ میں نے پرسکون انداز میں اس سے ملاقات کی۔ پھر میں اصل بات پر آگیا۔

''وکیل صاحب اس کہانی کا انجام بہت برا ہوگا۔''

''کیا......کیا مطلب ؟''

''مجھے اس کہانی کے ماموں مل گئے ہیں۔'' یہ کہہ کر میں نے ایک گروپ فوٹو ان کے سامنے کر دی جس میں وکیل صاحب میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے' اور اب ان ماموں کو اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے چھری کا بھر پور وار ان پر کیا اور ان کی روح نفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ میں اس فلم کے اختتام سے پوری طرح متفق تھا۔

ختم شد

سونی

جانوروں کی انسانوں سے وفاداری کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں' انہی میں سے ایک مثال میری سونی کی ہے۔ ریشم جیسے سفید لمبے بالوں اور نیلی شریر آنکھوں والی بلی میں نے بچپن سے پالی ہوئی تھی' میں اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ پھر جب میری شادی ہوئی تو جہیز میں سونی بھی میرے ساتھ کر دی گئی۔ سونی کو دیکھ کر میرے شوہر کہنے لگے کہ یہ تو مجھے اپنی رقیب لگتی ہے۔ بہرحال وہ بھی سونی سے بہت پیار کرتے تھے۔

ہماری شادی کو پانچ سال گزر گئے لیکن میرے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی' میں نے اپنی محرومی کو محسوس کیا مگر میرے شوہر بڑے زندہ دل انسان ہیں وہ کہتے تمہیں اولاد کی ضرورت بھی کیا ہے۔ سونی سے بڑھ کر تمہیں اپنا بچہ بھی عزیز نہ ہوگا۔ میرے سسرال والوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں کہ دلہن نے منحوس بلی پالی ہے۔ پھر ایک نجومی کو میرا ہاتھ دکھایا گیا تو اس نے بتایا کہ بہو پر کسی بدروح کا سایہ ہے۔ یہ سایہ کسی جانور کی شکل میں بہو کی تقدیر کو بس میں کئے ہوئے ہے۔ میری وہمی ساس نے نجومی کی بات گرہ میں باندھ لی اور وہ سونی سے چھٹکارا پانے کے پروگرام بنانے لگیں۔ پھر

ایک دن انہوں نے اپنے اس پروگرام پر عمل کر ڈالا۔

میرے شوہر ایک کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے' دوسرے دن میں جب صبح سو کر اٹھی تو سونی غائب تھی۔ بچوں کو انعام کا لالچ دے کر دوڑایا' پھر کافی دوڑ دھوپ کے بعد پتہ چلا کہ سونی کو میری ساس نے کہیں دور جنگل میں پھنکوا دیا تھا۔ بہرحال میں اس کے ردعمل کے طور پر کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔ تیسرے دن میرے شوہر کی واپسی ہوئی اور انہوں نے عجیب سے انداز میں سونی کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتایا کہ سونی غائب ہے۔ اس کے بعد انہوں نے جو کچھ سنایا اسے سن کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے بتایا۔

''مجھے واپسی میں رات کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ راستے میں ایک جگہ بس خراب ہو گئی۔ ڈرائیور کے مطابق قریب کسی بستی میں مکینک کا مل جانا متوقع تھا۔ چنانچہ ڈرائیور اپنے ایک ساتھی کے ساتھ وہاں چل پڑا۔ کچھ مسافر نیچے اتر کر ادھر ادھر گھومنے لگے' میں بھی نیچے اتر کر بے مقصد گھومتا رہا' پھر میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں بے شمار جھاڑیاں تھیں۔ اچانک جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں سے ایک سانپ نکل کر میری طرف بڑھا لیکن عین اسی وقت کہیں سے ایک بلی برآمد ہوئی اور اس نے سانپ پر حملہ کر دیا' بلی نے پہلی ہی جست میں سانپ کے پھن کو منہ میں دبا لیا تھا' سانپ نے اپنا پورا جسم بلی کے گرد لپیٹ دیا۔ ان دونوں میں خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ سانپ اپنا پھن چھڑانے کے لیے پوری جدوجہد کر رہا تھا۔ لیکن بلی نے پوری قوت سے پھن پکڑا ہوا تھا اور اس کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔ پھر دونوں ہی ٹھنڈے پڑ گئے تھے' سانپ تو بالکل ہی مردہ ہو گیا تھا۔ بہرحال میں نے ہمت کر کے قریب ہی پڑی ہوئی لکڑی اٹھائی اور بلی کے جسم پر سے سانپ کے بل کھولنے لگا۔ پھر میں نے سانپ کو لکڑی سے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ اس کے بعد ٹارچ کی مدد سے بلی کا جائزہ

لینے لگا۔ میرے پیر بلی کے بالکل قریب تھے' بلی نے بمشکل اپنی زبان نکالی اور میرے پاؤں چاٹنے لگی۔ میں نے غور کیا اور پھر میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ یہ بلی ہماری اپنی سونی تھی' میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہماری سونی تھی۔ اس بیابان میں' میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں اس کے بدن کی جان نکل گئی اور میں وہاں سے ہٹ گیا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد ہماری بس ٹھیک ہو گئی اور ہم لوگ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔''

میری سونی کی وفاداری کام آ گئی تھی' گھر سے جانے کے بعد بھی اس نے میرے سرتاج کی حفاظت کی تھی اور میرا گھر اجڑنے سے بچا لیا تھا۔

ختم شد

غلطی

عدالت میں پیشی جاری تھی، بہت سے لوگ اس دلچسپ کیس کو سننے کے لیے کمرہ عدالت میں موجود تھے۔ وکیل استغاثہ نے کہا۔

جناب والا! ملزمان پیشہ ور مجرم نہیں ہیں بلکہ تعلیم یافتہ نوجوان ہیں بیروزگاری سے تنگ آ کر انہوں نے ڈکیتی کرنے کی کوشش کی لیکن ناتجربے کاری کے باعث اس میں ناکام رہے، جناب والا! اپنے بیان کے مطابق ملزمان نے ایک جیولر شاپ کی مسلسل ایک ہفتے تک نگرانی کی، اس کے گرد و پیش کا جائزہ لیا، پھر اپنے منصوبے کے مطابق وہ لوگ اس وقت جیولر کی دکان پر پہنچے جب وہاں رش نہ ہونے کے برابر تھا، جناب والا! اس کیس کی سب سے مزیدار بات یہ ہے کہ اس واردات میں کسی بھی قسم کا اسلحہ پستول چھری یا ایک چھوٹا سا چاقو تک استعمال نہیں ہوا۔" وکیل استغاثہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا تو عدالت میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں، جج صاحب ایک لمحے کے لیے خود بھی چونک گئے تھے، لیکن پھر انہوں نے سنبھلتے ہوئے ہتھوڑی بجا کر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ وکیل استغاثہ نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ ملزمان نے ایسا نہ کر کے کم عقلی کا ثبوت دیا۔ بلکہ انہوں نے نہایت ہوشیاری سے ایک ایسی گیس دکان اور اس کے

اطراف میں پھیلا دی جس کی حد میں آنے والا ہر انسان اسے سونگھ کر بے ہوش ہو جائے۔ خود اس گیس کے اثرات سے بچنے کے لیے انہوں نے اپنے بچاؤ کے لیے ایک خاص قسم کے ماسک اپنے چہروں پر لگائے ہوئے تھے جن کا کنکشن ان کے لباس میں چھپے آکسیجن کے چھوٹے چھوٹے سلنڈروں سے تھا۔ پھر انہوں نے سارا زیور اور ہیرے وغیرہ سمیٹے اور باہر نکلنے لگے، لیکن بس وہیں وہ مار کھا گئے۔"

"وہ کیسے؟" جج نے دلچسپی سے پوچھا۔

" جناب عالی! ان ناتجربے کار ملزموں نے ڈکیتی کے لیے انوکھا طریقہ ضرور دریافت کیا لیکن دکان کے اندر موجود خودکار لاکنگ سسٹم سے واقفیت حاصل نہ کر سکے، اصل میں دکان کے اندر ایک جدید لاکنگ سسٹم ہے جس کا سینسر دکان کے مالک کی آنکھ کے اشارے پر چلتا ہے اور خودکار دروازہ اس سینسر کے تابع ہے۔ اب چونکہ مالک تو بے ہوش ہو گیا تھا اس لیے دکان کا دروازہ نہیں کھل سکا۔ ملزموں نے دروازہ توڑنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن بے سود، وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ملزمان کے پاس آکسیجن کا اسٹاک بھی ختم ہو گیا اور مجبوراً انہیں اپنے ماسک اتارنے پڑے، جس کے نتیجے میں وہ بھی اندر موجود گیس سے بے ہوش ہو گئے۔ اور اب جناب والا میں اپنی بات کی خود ہی تردید کرتا ہوں واقعی آتشیں اسلحہ ساتھ نہ رکھ کر ملزمان نے انتہائی بے وقوفی کا ثبوت دیا۔" وکیل استغاثہ ایک بار پھر رک گیا، ملزمان کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ اس بات پر مزید حیرت زدہ ہو گئے تھے جج صاحب خود بھی بے چینی محسوس کر رہے تھے، وکیل استغاثہ نے پھر کہا۔

"پولیس جب موقعہ واردات پر پہنچی تو اس نے دروازہ کھولنے کے لیے آتشیں اسلحے کا استعمال کیا اور پستول کی ایک گولی سے شیشے کا دروازہ ٹوٹ گیا کیونکہ وہ بلٹ پروف نہیں تھا۔"

ختم شد

روشنی سے پیچھے کے لوگ

راجن نے پہاڑی غار کا دروازہ کھسکایا اور پھر ہم لوگوں کو پاس بلانے کا اشارہ کیا۔

''آؤ صاحب آ جاؤ' ادھر اس طرف۔'' ہم لوگ اس کے پاس پہنچ گئے تھے اور پھر ہم لوگ ایک ایک کر کے پہاڑی غار میں داخل ہو گئے۔ ہمارے پاس بہترین ٹارچیں موجود تھیں جو ہمیں آگے بڑھنے میں مدد دے رہی تھیں۔ تھوڑی دور چل کر ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں وہ ڈھانچے موجود تھے' ہمارے ایک ساتھی حمزہ ان ڈھانچوں کے قریب جا کر ان کا جائزہ لینے لگا پھر اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مائی گاڈ! ثانی دیکھو' یہ زیورات' ان کے ڈیزائن' یہ نقش' ان کی بناوٹ سے بھی ان کے دور کا تعین نہیں ہو رہا' اس کا مطلب یہ ہے کہ کہ...... ہمیں ایک انتہائی قدیم تہذیب کے آثار مل گئے ہیں اور ہمارے گروپ کو ایک تہذیب دریافت کرنے کا موقع مل گیا ہے۔'' راجن نے حمزہ کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''بالکل صحیح کہا آپ نے کیونکہ یہاں پھیلے ہوئے غاروں میں ان لوگوں کی پوری بستی آباد ہے۔''

''اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یونیورسٹی کے آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں ہمارے

ٹیچ کو نہ صرف یونیورسٹی بلکہ حکومت کی طرف سے بھی خصوصی انعام ملنے کی توقع ہے۔''
حمزہ کی اس بات پر سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ ''اور اب کل صبح پہلا کام یہ کرنا ہوگا کہ یونیورسٹی پینل کو اطلاع دی جائے' پھر ان کی تصاویر وغیرہ کل اتاریں گے۔'' سب بے حد خوش تھے' میں بھی بہت خوشی محسوس کر رہی تھی کہ ہماری ٹیم نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ پھر صبح کے پروگرام ترتیب دیتے ہوئے ہم اپنے خیموں میں آ گئے۔

ہمارا گروپ یونیورسٹی کے آرکیالوجی ڈیپارٹمنٹ کا محنتی گروپ ہے۔ ہم ایسے پراجیکٹس پر کام کرتے تھے جو منفرد ہوں' اسی جذبے کے پیش نظر ہم نے ملک کے مختلف علاقوں میں کیمپنگ کا پرگرام بنایا تھا' اور اس جگہ ہمیں کامیابی ہو گئی تھی۔ لیکن پھر مجھ سے ایک ایسی غلطی سرزد ہو گئی جس کا ازالہ آج بھی ناممکن ہے۔

رات کو اپنے خیمے میں لیٹے لیٹے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ تصویروں کے لیے کل دن میں پورا گروپ وہاں جائے گا' سب اپنے کیمروں سے تصویریں وغیرہ لیں گے' کیوں نہ میں رات کو سکون سے یہ کام کر لوں۔ اس طرح میری تصویریں بھی الگ اسٹائل کی ہوں گی اور میرا تھیسس بھی منفرد ہوگا۔ بس اسی خیال کے تحت میں نے اپنا کیمرہ اٹھایا اور اس غار کے پاس پہنچ گئی۔ ڈر تو بے شک لگ رہا تھا' لیکن لگن اور شوق کی خاطر میں نے خوف کو اندر دبا لیا اور ہمت کر کے غار کا دروازہ کھسکایا' طاقتور ٹارچ کسی حد تک میری رہنمائی کر رہی تھی۔ پھر میں اس جگہ پہنچ گئی جہاں ڈھانچے پڑے ہوئے تھے۔

ٹارچ سیدھی کر کے اس کی بھرپور روشنی میں نے ڈھانچوں پر ڈالی اور پھر کیمرہ سیٹ کر کے ایک ڈھانچے کی انگلیوں میں موجود انگوٹھیوں اور گلے میں پڑے ہوئے زیورات کی تصاویر لینے لگی۔ پھر فلیش کے ایک جھماکے کی روشنی سیدھی ایک کھوپڑی پر

پڑی اور یہیں سے مصیبت کا آغاز ہوگیا۔ کھوپڑی میں تحریک ہوئی تھی اور اس کا سر اچھا خاصہ اوپر اٹھ گیا۔ پھر کھوپڑی کے دانت ہلنے لگے جیسے وہ کچھ کہہ رہی ہو۔ اس وقت میرا شوق اور میرا فن دونوں ہی میری جان کے دشمن بن گئے تھے کیونکہ اس کھوپڑی کے منہ سے جو الفاظ ادا ہورہے تھے وہ آسانی سے میری سمجھ میں آرہے تھے۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہہ رہی تھی۔

''یہ کون آگیا ہماری نیند برباد کرنے' کون ہے یہ اجنبی عورت۔'' دوسری کھوپڑی میں بھی جنبش ہوئی اور وہ بھی سیدھی ہوگئی۔ اسے سزا دو۔ اس کی ایک انگلی کاٹ لو۔ آہ یہ منظر کتنا خوفناک تھا۔ اس کھوپڑی کی آنکھوں کی جگہ دو انگارے دہک رہے تھے اور وہ مجھے اس طرح گھور رہے تھے جیسے مجھے جلا کر ہی دم لیں گے۔ دوسرے مردے کی آواز ابھری۔ اس نے کہا نئے دور کی کوئی عورت جونہیں جانتی کہ ہم روشنی سے پیچھے کے لوگ ہیں۔

اس نے پاس پڑے ہوئے ڈھانچوں سے کہا اور پھر جو منظر میرے سامنے آیا وہ میرے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

سارے ڈھانچے اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ ان سب کی آنکھیں انگاروں کی مانند روشن تھیں اور ان کے ہاتھوں میں خنجر چمک رہے تھے اور اب وہ سب میری ہی طرف بڑھ رہے تھے۔ کیمرہ اور ٹارچ دونوں میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئے اور میں ہولناک انداز میں چیختی ہوئی باہر کی طرف بھاگی تھی۔ میں پوری قوت سے باہر کی طرف بھاگی جارہی تھی جبکہ ڈھانچے اپنے خنجر لہراتے ہوئے میرے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ خوف و دہشت سے ہاتھ پیر پھولے جارہے تھے لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور پھر غار کا دہانہ قریب آ گیا' لیکن اب میرا اور ان ڈھانچوں کا فاصلہ بھی بہت کم رہ گیا تھا۔ میں تیزی سے غار کے دہانے پر پہنچی اور دروازہ بند کرنے

کی کوشش کرنے لگی۔ عین اسی وقت ایک ڈھانچے نے قریب پہنچ کر مجھ پر وار کر دیا تھا' ہاتھ میں چوٹ لگی تھی لیکن میں نے اس کی پرواہ کیئے بغیر جلدی سے دروازہ واپس کھسکانے کی جدوجہد شروع کر دی اور مجھے اس میں کامیابی نصیب ہوئی تھی' لیکن اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔

جب ہوش آیا تو میرے کیمپ کے سارے ساتھی میرے گرد جمع تھے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ میں ان کو غار کے باہر بے ہوش ملی تھی' مجھے فوری طور پر شہر بھیج دیا گیا اور اب مجھے دو دن کے بعد ہوش آیا ہے۔ پھر میں نے انہیں اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ سنایا' میں اپنی اس حرکت پر پشیمان بھی تھی پھر ہمارے گروپ لیڈر نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ثانی! دن کی روشنی میں ہم سب لوگ وہاں گئے تھے' سب لاشیں جوں کی توں موجود ہیں۔ بلکہ صرف اسی غار میں نہیں کئی اور غاروں میں ان کے آثار ملے ہیں' اور ہمیں اس بات کا افسوس ضرور رہے گا کہ تم نے آگے بڑھنے کی دھن میں اپنا ایک نقصان کر ڈالا۔'' یہ کہہ کر حمزہ نے میرا دایاں ہاتھ میرے سامنے کر دیا جس کی چھوٹی انگلی غائب تھی۔

ختم شد

دلدل

شہر میں تو خیر ہم پر بہت سی پابندیاں تھیں۔ یہ نہ کرو وہ نہ کرو' یہاں نہ جاؤ وہاں نہ جاؤ۔لیکن جب سے پاپا ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے ہم اپنے آبائی قصبے عادل شاہ میں آ گئے تھے۔ اب تو یہاں آئے ہوئے بھی ہمیں تین سال گزر گئے تھے۔ لیکن پابندیاں وہی کی وہی تھیں۔ ممی ہر وقت ایک ہی بات کہتی تھیں کہ تم اب بڑی ہو گئی ہو۔ اکیلی باہر نہیں جایا کرو۔ لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلا کرو۔ شام کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلا کرو۔ اجنبی مردوں سے باتیں مت کیا کرو۔ حالانکہ میں اب اتنی بڑی بھی نہیں ہوں۔ میری عمر صرف تیرہ سال ہے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ میں ذرا صحت مند ہوں۔ میرا قد عام لڑکیوں کے مقابلے میں کچھ بڑا ہے۔ تھوڑی سی موٹی بھی ہوں۔ میرا بھائی ناظم مجھ سے ڈیڑھ سال بڑا ہے۔ لیکن اسے کوئی بھی بڑا نہیں کہتا۔ نہ ہی اسے کسی بات پر ٹوکا جاتا ہے۔ میرے ممی' پپا کا خیال ہے کہ مجھے اچھائی برائی میں تمیز کرنا نہیں آتی۔ خیر میں زیادہ تیز طرار نہیں ہوں۔ میرا ذہن ذرا سست روی سے ہی سوچتا ہے اور دوسروں کی باتیں فوراً میری سمجھ میں نہیں آتیں۔

ساحل کے ساتھ ساتھ ایک وسیع علاقے میں قد آدم جھاڑیاں اور درخت اگے

ہوئے ہیں۔ جھاڑیوں کے درمیان بعض جگہوں پر پانی کھڑا ہے اور بعض جگہیں خشک ہیں۔ ناظم اور افضال اکثر ادھر جاتے ہیں۔ افضال مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ چہرہ لومڑی کے جیسا ہے۔ بہت تیز تیز باتیں کرتا ہے' یہ دونوں مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے مخالف ہیں اور ایک ہی بات کہتے ہیں۔

''دیکھو باز آ جاؤ کسی دن دلدل میں پھنس جاؤ گی اور ہم مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔''

''میں کیوں پھنسوں گی دلدل میں؟''

''اس لیے کہ تم بے وقوف ہو۔ یہ ساحلی دلدلی علاقہ ہے اور یہاں بہت سی جگہوں پر دلدل ہے۔'' لیکن ایک دن میں نے ان کا پیچھا کر ہی لیا۔

میں موقع پا کر باہر نکل آئی اور ان کے پیچھے پیچھے چلتی رہی اور آخر کار ایک پرانے اور گھنے پیڑ کے نیچے پہنچ گئی۔ پیڑ کے آگے زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہموار میدان کی طرح تھا۔ وہاں نہ تو گھاس اگی ہوئی تھی اور نہ کوئی دوسرا پودا اچانک ہی مجھے افضال کی آواز سنائی دی۔

''نیئر......نیئر......رکو نیئر رک جاؤ۔'' میں نے دیکھا کہ ناظم اور افضال دوڑ کر میرے پاس آ رہے ہیں۔

''تمہیں خدا کا واسطہ بچ گئیں بال بال' یہ سامنے جو خالی جگہ تمہیں نظر آ رہی ہے نا۔ یہ دلدل ہے۔ اگر تم اس میں قدم رکھ دیتیں تو ہمیشہ کے لیے اس میں دفن ہو جاتیں بیوقوف لڑکی۔''

''تم بکواس کر رہے ہو۔''

''دیکھو میں تمہیں بتائے دے رہا ہوں آئندہ کبھی بھول کر بھی ادھر مت آنا۔''

میں اس دن تو واپس چلی آئی۔ لیکن دوسرے دن میں نے خاص طور سے ادھر کا رخ

کیا اور موقع پا کر اس درخت کے نیچے پہنچ گئی۔ دراصل میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ واقعی دلدل ہے یا یہ لوگ مجھے بیوقوف بناتے ہیں میں نے سڑک سے ایک پتھر اٹھا کر اس صاف جگہ پھینکا۔ کیچڑ کے چند چھینٹے اڑے اور پتھر سطح کے اندر چلا گیا۔

بڑے بڑے پتھر میں دلدل میں اٹھا اٹھا کر پھینکتی رہی اور وہ غائب ہوتے رہے۔ بہرحال اس کے بعد جب بھی مجھے موقع ملتا میں جنگل میں چلی جاتی۔

ایک روز میں اپنے گھر سے باہر نکلی تو مجھے بیگ صاحب کی بلی نظر آئی۔ مجھے بلی سے سخت نفرت تھی۔ وہ ہمارا ایک مرغا کھا گئی تھی۔ اکثر باورچی خانے میں داخل ہو کر دودھ پی جاتی تھی۔ کئی بار اس نے ہمارے گھر کے قالین پر غلاظت کی تھی۔ میں نے بلی کو چمکارہ تو وہ میرے قریب آ گئی۔ میں اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی کچھ لمحوں کے بعد میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور جنگل کی طرف روانہ ہوگئی۔ دلدل کے کنارے پہنچ کر میں نے اسے دلدل کے بیچ میں پھینک دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوشش کر کے کنارے پر آ جائے گی۔ لیکن وہ جہاں گری تھی وہاں سے ایک تل بھی ادھر ادھر نہ ہوسکی۔ اس کے چاروں پیر فوراً ہی دلدل میں غائب ہو گئے۔ پھر وہ خود بھی آہستہ آہستہ نیچے چلی گئی۔ مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا تھا وہ تھی ہی ایسی......

میں وہاں سے واپسی پلٹی تھی کہ سامنے سے بیگ صاحب نظر آئے اور میں ایک دم چونک پڑی۔

''ہیلو بے بی...... کہاں جارہی ہو؟''

''اوہ انکل! بس ایسے ہی۔''

''وہ بلی کہاں گئی؟ ابھی میں نے اسے تمہاری گود میں دیکھا تھا۔''

''بب...... بلی، وہ تو میری گود سے نکل کر بھاگ گئی تھی۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''اوہو اچھا...... آؤ ذرا اسے تلاش کریں۔ تم بہت پیاری لڑکی ہو۔ آؤ ذرا

......آؤ ......اور دیکھو یہ ٹافیاں ہیں۔ میں بہت دن سے انہیں لئے پھر رہا ہوں۔ بس نجانے کیوں تم مجھے بڑی اچھی لگتی ہو۔'' بیگ صاحب اپنی بلی ہی کی طرح مجھے برے لگتے تھے۔ عجیب عجیب نگاہوں سے مجھے گھورتے رہتے تھے۔ جب بھی میں باہر نکلتی ان کی آنکھیں میرا پیچھا کرتی تھیں۔

بہرحال وہ مجھے ساتھ لے کر ایک صاف سی جگہ پہنچ گئے۔ اور بولے......

''بیٹھو میرے پاس بیٹھو'' وہ مجھے اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے بولے اور نجانے کیوں میرے اندر ایک عجیب سی گھبراہٹ نمودار ہوگئی۔ میں نے ان سے بچنے کی لاکھ کوشش کی لیکن بیگ صاحب عجیب چپکو آدمی تھے۔ تب اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا میں نے بیگ صاحب سے کہا۔

''آپ نے کبھی آنکھ مچولی کھیلی ہے انکل۔''

''آنکھ مچولی...... نن...... نہیں تو۔''

''آیئے کھیلتے ہیں۔ میں آپ کی آنکھوں پر رومال باندھ دیتی ہوں اور آپ مجھے پکڑیں۔''

''ہوں۔'' بیگ صاحب مجھے عجیب شرارت بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے پھر بولے۔

''اچھا۔ ایک بات سنو اگر میں نے تمہیں پکڑ لیا۔ تو تمہیں وہی سب کچھ کرنا ہو گا جو میں تم سے کہوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ بیگ صاحب کی جیب سے ایک بڑا سا رومال نکال کر میں نے احتیاط سے ان کی آنکھوں پر باندھ دیا۔

پھر کھیل شروع ہو گیا۔ میں نے کچھ فاصلے پر جا کر تالی بجائی اور جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ بیگ صاحب میرے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے اور میں آہستہ آہستہ

آگے بڑھتی ہوئی دلدل کے کنارے تک پہنچ گئی۔ وہ مجھ سے دس قدم دور تھے اور دونوں ہاتھ پھیلائے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس بار میں نے ذرا دیر تک تالی بجائی اور ساتھ ہی آواز دی۔

''میں یہاں ہوں انکل! مجھے پکڑ لیجیے۔'' بیگ صاحب مسکرا کر میری جانب دوڑے اور میں جلدی سے ایک طرف ہوگئی۔ وہ دوڑتے ہوئے دلدل میں داخل ہو گئے اور اچانک ہی رک گئے۔ پھر انہوں نے گھبرائے ہوئے انداز میں آنکھوں پر سے رومال ہٹایا اور ان کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔ لیکن وہ دلدل میں دھنستے جارہے تھے۔ ان کے ہاتھ اور کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو گئے تھے اور آنکھیں خوف کے سبب باہر ابل پڑی تھیں۔

''اوہ میرے خدا...... مم...... میں دلدل میں پھنس گیا ہوں۔ جلدی کرو نیئر پلیز جلدی کرو۔ کوئی لمبی سی لکڑی توڑ کر لاؤ۔ جلدی کرو...... میں نیچے جارہا ہوں۔'' لیکن میں سکون کے ساتھ کنارے پر بیٹھ گئی اور چھوٹے چھوٹے کنکر اٹھا کر اس کی طرف پھینکنے لگی۔ اب میرا ذہن حیرت انگیز طور پر صاف اور واضح انداز میں سوچ رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

بیگ صاحب! تھوڑی دیر پہلے میں بھی دلدل میں پھنس گئی تھی لیکن اللہ کی مہربانی ہوگئی اور میں صاف بچ نکلی۔ ایک بات بتاؤں نیچے جائیں گے تو آپ کو آپ کی بلی مل جائے گی۔ وہ بھی نیچے ہی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور بیگ صاحب کو بلی کی تلاش میں دلدل میں گم ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر جب دلدل کی سطح صاف اور چکنی ہوگئی تو میں نے واپسی کے لیے قدم بڑھا دیئے۔

آج شاید مجھے پتہ چل گیا تھا کہ دلدل کیا چیز ہوتی ہے۔

ختم شد

نیلم کہانی

سرسبز و شاداب وادی اور بلند و بالا پہاڑوں کی اس سرزمین میں بہتا ہوا دریائے نیلم نجانے کیسی کیسی حسین داستانیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ آس پاس چھوٹی چھوٹی آبادیاں کھلونوں کی طرح بکھرے ہوئے گھر' ہر گھر کی ایک کہانی۔ دریائے نیلم کے آس پاس پڑے ہوئے۔ پتھروں میں لکھے ہوئے نام اور اس کے بعد سفید جھاگ اُڑاتی ہوئی لہریں ایک ادیب کے ذہن کو نجانے کیسے کیسے جہانوں کی سیر کرا دیتی ہے۔ دریائے نیلم کے کنارے پڑا ہوا یہ سبز پتھر یہ ثابت کرتا ہے کہ پتھر کے دل میں بھی گداز ہوتا ہے۔ نجانے کیسے کیسے دلکش مناظر اور کیسی کیسی انوکھی کہانیاں اس وادی میں بکھری پڑی ہوئی ہیں۔ کبھی کسی زمانے میں یہاں حسین پروں والی پریاں اور ننھے ننھے بونے ہوا کرتے تھے اور وہ صدیوں سے ان وادیوں میں آباد تھے۔ لیکن وہ غیر فانی نہیں تھے۔ بے ضرر اور معصوم مخلوق۔ انسان ترقی کی راہ پر آیا اور ان ننھے بونوں کا قد مختصر ہونے لگا۔ جوں جوں دنیا سے اخلاص اور ایثار ختم ہوتا گیا ان کی جسامت کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ان کا وجود ناپید ہوگیا۔

اس حسین وجمیل وادی میں' سرسبز گھاس کے ان قطعوں میں جہاں خوش رنگ

پھولوں کے تختے پھیلے ہوئے ہیں۔ نجانے کیسی کیسی داستانیں بکھری ہوئی ہیں اور ایک ادیب کی آنکھ ان داستانوں کو ان کے حقیقی روپ میں دیکھ سکتی ہے۔ سالہا سال پہلے اسی دریائے نیلم کی گنگناتی دھاروں کے قریب ایک بستی میں ایک خوبصورت سی لڑکی رہا کرتی تھی۔ اس زمانے میں ننھے بونے اور پریاں ان وادیوں کو چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ وہ اس لڑکی کے دوست تھے اور اس لڑکی کو پریوں اور ننھے بونوں کی رفاقت حاصل تھی۔ وہ ان کے تمام رازوں سے واقف تھی۔ گرمیوں کی سہانی راتوں میں دریا کے کنارے گھومنے پھرنے نکل جاتیں۔ جہاں پر ہر رنگ کے پھول کھلے ہوتے اور ان پھولوں کے درمیان سبز اور سنہری لباس میں ملبوس سینکڑوں بونے اور اتنی ہی پریاں روشنی اٹھائے اس کے منتظر ہوتے۔ فضا میں ننھی ننھی پریاں قطار در قطار پرواز کررہی ہوتیں۔ ان کے ہاتھوں میں سونے کی گھنٹیاں ہوتیں۔ جن کی مدھر آواز اس لڑکی کو مدہوش کر دیتی۔ وہ ننھے ننھے بونے اور وہ پریاں اس لڑکی کے دوست تھے۔

چنانچہ اس لڑکی کی تمام رات آوارہ گردی کے باوجود اس کے گھر کا تمام کام بہت اچھی طرح پورا ہو جاتا تھا۔ وہ صبح سویرے تمام لوگوں سے پہلے اپنی بکریوں کا دودھ دوہیا کرتی تھی۔ چولہے میں آگ روشن کر دیتی اور ایندھن لے آتی۔ اس کا قابل رشک کام اس کی زردوزی کی کڑھائی تھی اور وہ اس ہنر میں اس قدر ماہر تھی کہ اس کے کام کے دور دور تک چرچے ہوا کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کے پاس ایک جادوئی سوئی ہے کچھ کا خیال تھا کہ اسے کسی پری نے ایسا جادوئی مرہم دیا ہے جس کو لگاتے ہی اس کی بینائی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ہے۔ لیکن اس لڑکی نے ہمیشہ یہ بات راز رکھی۔ جب کبھی بھی رات کو لوگ اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کرتے۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کے کانوں میں زور زور کی آوازیں گونج رہی

ہوں۔ جیسے بہت سی مکھیاں محو پرواز ہوں۔ اور پھر ان کے قدم زمین سے چپک جاتے اور ان میں سوئیاں چبھنے لگتیں اس کے ساتھ ہی ان کی زبان بھی حلق سے باہر نکل آتی اور پھر اس وقت ان کی جان چھٹتی جب وہ لڑھکتے پڑکتے اپنے گھروں کی جانب لوٹ جاتے۔

وہ لڑکی آخر کار ایک نوجوان کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ جو اسی کے گاؤں کا تھا لیکن انتہائی غریب اور وہ نوجوان دولت کمانے کے لیے شہر روانہ ہوگیا۔ لڑکی اس کا انتظار کرتی رہی اور جب وہ واپس نہ آیا تو وہ خود بھی شہر کی گھنی آبادیوں میں چلی گئی۔ جہاں پریوں کا کوئی وجود نہیں تھا اور نہ ہی یہ پریاں اپنی دلکش وادی کو چھوڑ کر کنکریٹ کے اس جنگل میں جاسکتی تھیں۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ اپنی دوست سے جدا ہوکر وہ پریاں اور ننھے بونے سخت اداس تھے۔ ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا وہ لڑکی اپنے محبوب کی تلاش میں دربدر بھٹکنے لگی۔ کتنے ہی گرم سرد موسم اس کے سر پر سے گزر گئے۔ اس کے کپڑے چیتھڑوں کی شکل اختیار کر گئے۔ اس کے چہرے کی بشاشت گم ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ انسانوں کے اس جنگل میں اسے کوئی پری نظر نہیں آئی تھی جو اس کی غم گزار ہوتی۔ وہ پریشان حال پھرتی رہتی۔ تمام دن وہ کام ڈھونڈتی رہتی۔ کام کوئی بھی چھوٹا موٹا کام جس سے پیٹ کا جہنم سرد ہو جائے اور شام ڈھلے وہ کسی گھنے درخت کے سائے میں لیٹ جاتی اور خالی پیٹ کے مطالبے کو نظر انداز کر کے سونے کی کوشش کرتی۔

ایک طویل عرصے سے اس نے پریوں اور بونے کی تلاش ختم کر دی تھی۔ اب سمندر کے کنارے جگمگاتی روشنیاں اسے بونے والے باغیچے کی یاد نہیں دلاتی تھی۔ نہ ہی بنگلوں کے بند دروازوں سے بلند ہونے والا موسیقی کا شور اسے پریوں

کی بھولی شہری مدھر موسیقی یاد دلاتا تھا۔ وہ کام کی تلاش میں پھرتی رہی اور آخرکار اسے کڑھائی کا کام مل گیا۔ اسے کام دینے والوں ایک موٹے پیٹ والا کریہہ صورت دکاندار بھی تھا۔ لڑکی اپنی دیانت اور محنت کے باعث نیک نام تھی۔ چنانچہ اسے اجازت مل جاتی کہ وہ قیمتی ریشمی کپڑے اور سونے کی تاروں کی گچھی اپنے گھر لے جائے۔ جہاں اب وہ ایک جھونپڑی میں رہنے لگی تھی۔ وہ تمام دن کام کرتی رہتی اس کے گھر کی ٹوٹی پھوٹی چھت کے اخنوں سے آسمان کا رنگ گہرے نیلے سے' گہرا سیاہ' پھر زردی مائل سنہرے رنگ میں تیل ہو جاتا' وہ اپنے گھٹنوں پر ہزاروں روپے کا ریشمی کپڑا ڈالے درجنوں گھنٹے کام کرتی رہتی۔ حالانکہ اس کے عوض اسے بہت تھوڑے پیسے ملتے تھے۔ اس کی انگلیاں درد کرنے لگتیں' سن ہو جاتیں۔ لیکن وہ اپنی انگلیوں کو مسلسل حرکت میں رکھتی اور پھر وہ شام آئی جب کئی دن سے اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ اسی شام اس موٹے دکاندار نے اس لڑکی کو ایک ریشم کا کپڑا دیا اور حکم دیا کہ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کام شروع کر دے۔ چونکہ اس کے گاہک کو بے حد جلدی ہے۔

لڑکی تمام دن اور تمام رات کام کرتی رہی' طویل رات کے بعد صبح کا اجالا پھیلا تو اس کا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ بس آخری کام اس نے کچھ نگینے لگانے تھے جو کہ سونے کے تاروں کے ذریعے لباس میں ٹانکے جانے تھے۔ ریشمی کپڑے کا ٹکڑا اس کے گھٹنوں پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے سوئی میں دھاگا ڈالا اور اپنی تھکی ہاری آنکھوں کو ملا۔ کام شروع کیا ہی تھا کہ اچانک اسے لگا کہ اس کے ایک ہاتھ کی جگہ وہاں چار چار ہاتھ موجود ہوں۔ ان چاروں ہاتھوں میں چار سوئیاں اور ان سوئیوں میں چار دھاگے تھے اور اب وہ اس سارے نگینے لباس میں ایک ہی وقت میں ٹانکے جارہے تھے۔

پریاں اور بونے اس کے پاس پہنچ گئے تھے اور اس کی مدد کے لیے آ گئے تھے۔ لڑکی کی آنکھوں سے شکر گزاری کے گرم گرم آنسو نکلے اور سرخ نگینے بھیگ گئے۔ لیکن دوسری صبح جب موٹے دکاندار نے اس سے کپڑا مانگا۔ تو وہ کپڑا اپنے گھٹنوں پر رکھے خاموش بیٹھی خلاء میں گھور رہی تھی۔ ریشمی کپڑا اس کے گھٹنوں پر پڑا ہوا تھا اور اس پر ایک ہی نگینہ ٹانکا جا سکا تھا۔ بمشکل تاہم لڑکی کو اسپتال لے جایا گیا۔ تب سرجن نے بتایا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اندھی ہو چکی ہے۔

ختم شد